جمالِ الٰہی



ابو الفیض قلندر علی سہروردی

جلّ و علا شانہٗ

جمالِ الٰہی

از

ابوالفیض قلندر علی سہروردی

ناشر

مرکزی مجلسِ سہروردیہ، قلعہ گوجر سنگھ، لاہور

نذرِ عبدیّت

یہ چند اوراق اسمی جمالِ الٰہی دربارِ معلّیٰ رب العٰلمین، رحمٰن و رحیم مالک یوم الدین میں بواسطۂ نبی الحرمین امام القبلتین مولٰنا و مولی الثقلین نورٌ من نور اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نذر ہیں۔

آرزو ہے کہ مولا کریم ان کو شرفِ اجابت بخش کر اپنے بندوں کو ان پر عمل کی توفیق رفیق فرمائیں۔ (وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ)

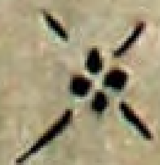
فہرس

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	نذرِ عبدیت	۲	۱۶	توحید، موحد اور مسئلۂ وحدت الوجود	۵۴
۲	ابتدائیہ	۴	۱۷	تحقیق مقام	۶۲
۳	حمد	۵	۱۸	اسماء اللہ الحسنیٰ	۶۵
۴	نعت	۶	۱۹	ذات وصفاتِ باری تعالیٰ	۱۰۲
۵	تمہید	۷	۲۰	عقیدۂ توحید	۱۰۶
۶	مذہب اور روح کے ابتدائی تصورات	۱۰	۲۱	ہستیٔ باری تعالیٰ پر استدلال	۱۱۳
۷	ایمان کی حقیقت	۱۳	۲۲	ممانعتِ شرک	۱۲۲
۸	ایمان باللہ جلّشانہٗ	۱۶	۲۳	خدائی نشانات	۱۲۹
۹	مسلکِ اہلسنت	۲۰	۲۴	دیدارِ الٰہی	۱۳۸
۱۰	منکرینِ خدا	۲۴	۲۵	کرسی کی حقیقت	۱۴۵
۱۱	حقیقتِ عبادت	۲۸	۲۶	مسئلۂ کشفِ ساق	۱۴۸
۱۲	استعانت	۳۶	۲۷	استویٰ علی العرش	۱۵۴
۱۳	عبد و معبود کے تعلقات	۳۹	۲۸	خیر و شر	۱۵۷
۱۴	تصورِ الٰہی کا تدریجی ارتقاء	۴۴	۲۹	جبر و قدر	۱۶۳
۱۵	خدا کا تصور اور غیر مذاہب	۴۸	۳۰	حشر و نشر	۱۶۸
			۳۱	علامات وتفصیلاتِ قیامت	۱۷۶

ابتدائیہ کلمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک ۰ باری الامم ۰ ومولی النعم ۰ الذی لا رادّ لما حکم ۰ ولا مانع لما اعطی وقسم ۰ المنفرد فی وجودہ بالقدم ۰ الحاکم علی من سواہ بالفناء والعدم ۰ ثمّ یعیدھم لفصل القضاء بینھم فیاخذ للمظلوم ممّن ظلم ۰ یجزی کلّ نفس بما عملت حسب ما علم تعالی وجری بہ القلم ۰ ویتدارک بعفوہ من شاء ومن شاء منہ انتقم ۰ لہ الامر کلّہ لا یسئل عمّا فعل واحتکم ۰ والسّلام علی سیّدنا محمّد المؤیّد بالحجّۃ السّاطعۃ والمعجزۃ الباھرۃ والعلم ۰ وعلی الہ واصحابہ وازواجہ وسلّم



حمد

ساری حمد اسی حقیقت الحقائق، اسی ذات علی الاطلاق اور اُسی ہستی وراء الوراء کے لیے ہے جو سب کی شہنشاہ اور فی الحقیقت سب سے متصل ہے۔ باوجودیکہ انگنت پردوں میں ہے اس کی ذات ازلی و ابدی اور من کل الوجوہ غیر فانی ہے۔ کائنات ارضی و سماوی میں کوئی بھی اُسکی ہمسری کے دعویٰ کا استحقاق نہیں رکھتا۔ بیشمار مخلوق اس غم میں مبتلا ہے کہ نہ اس تک رسائی کی راہ ملتی ہے اور نہ اس کی طرف سے صبر کر کے بیٹھ جانا ممکن ہے۔ نہ کوئی عقل اس کی کمال شان کو پہنچ سکے اور نہ کوئی آنکھ کامل طور پر اس کے جمال و آن سے مشرف ہو سکے۔ مُقر منزل اقرار میں حیران اور منکر مقامِ انکار میں سرگرداں ہو کر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہے کہ :- شعر

تیرا ادراک، فہمِ ناقصِ انسان سے بالا ہے
کہ تیری جستجو میں عقل کو گمراہ پاتا ہوں
مری آنکھوں کو بینائی کا شکوہ ہے مگر پھر بھی
تجھے ہر چیز میں موجود اے اللہ پاتا ہوں



نعت

کلمہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ نعت کا وہ لازوال مفہوم ہے جس سے مولائے کُل ختمِ رُسل، ہادئ سُبل صلی اللہ علیہ وسلم بعد از خُدا بزرگ، انوارِ الٰہی کے آئینہ، ساری کائنات کے زیج، تخلیقِ کون و مکاں کے سبب، اوّل و آخر کے نُور، ظاہر و باطن کے ظہور، قرآنِ پاک کی بہار، حدیثِ ربّ العزت کے نکھار، دُرود و سلامِ خدا کے مقام، مبارک و پاکیزہ تحیّات کے انجام، نعمتوں کے قاسم، انبیاء و رُسل کے خاتم، رنج و الم کے قاطع، بلا، و وبا کے دافع، مومنوں کے ایمان اور معرفتِ معبود کا عنوان ثابت ہوتے ہیں۔

وَصَلَّی اللہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ
وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمْ



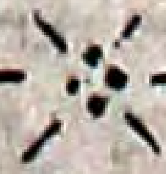
تمہید

کسی نہ کسی مافوق الانسان ہستی کو اپنا مالک و خالق جاننا اور اُسے قادرِ مطلق ماننا انسانی فطرت میں داخل ہے ایک جاہل سے جاہل وحشی کے ہاتھ بھی جس نے کبھی خدا کا نام تک نہ سُنا ہو تکلیف اور مصیبت کے وقت بالکل غیر اختیاری اور اضطراری طریقے پر استمداد کے لیے کسی ایسی ہستی کی طرف ضرور اُٹھ جاتے ہیں جسکو وہ سمجھتا ہے کہ اس میں سب قدرت ہے اور جس کے متعلق اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کو اس کی مصیبتوں سے نجات دے سکتی ہے۔ دعا مانگنے کے بعد روح میں کسی قدر تسکین اور قلب میں کسی قدر طمانیت کا پیدا ہو جانا ایک یقینی اور لازمی امر ہے۔ اور یہ سکون و اطمینان بالکل اسی قسم کا ہوتا ہے۔ جیسے بچہ اس وقت محسوس کرتا ہے جب اسے کوئی ستائے اور وہ اپنا دُکھ درد گھر آکر اپنے ماں باپ سے بیان کر دے جن کے متعلق بچے کو یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کی مدد پر قادر ہیں۔ طبعاً دُکھے ہوئے دل میں اس قسم کے اطمینان کا پیدا ہونا بھی اسی امر کا ثبوت ہے کہ اپنے سے بالاتر کسی ہستی کو تسلیم کرنا اور اسے قادرِ مطلق جاننا انسانی فطرت میں داخل ہے۔

بچہ میں جس وقت ذرا سا بھی شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ کسی قدر بولنے لگتا ہے تو ہر چیز کے متعلق باوجود اس کے کہ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت کم ہوتا ہے جو اس کی نگاہوں کے سامنے آئے اس کے یہی سوالات ہوتے ہیں کہ یہ چیز کیا ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ فطرت نے تجسس اور تحقیق کا یہ شوق اسی لیے اس کو ودیعت فرمایا ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے علم کو پورا کرے اور اپنے گرد و پیش کی تمام اشیاء سے اچھی طرح واقف ہو جائے تجسس اور تلاش کا یہی ذوق اور ہر چیز کی حقیقت اور ماہیت سے آگاہ ہو جانے کا یہی شوق ایک بالکل غیر محسوس طریقے پر اس کے دل میں مناظرِ قدرت کے متعلق بھی یہی سوالات پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور اس کو ہر وقت یہی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کہ سورج کیا شے ہے، چاند کہاں سے آیا ہے۔ رات کو ستارے کون روشن کیا کرتا ہے۔ کالے کالے بادلوں کے پہاڑ، ہوا پر اڑتے ہوئے کہاں سے آجاتے ہیں، گرج کی مہیب آواز کیونکر پیدا ہوتی ہے، بجلیاں

کیوں چمکتی ہیں۔ پھول اور تتریاں کون بنایا کرتا ہے۔ پھولوں کی رنگینی میں کس کی تقسیم کام کرتی ہے۔ زمین سے سبزہ اور انڈوں سے بچے کون نکالتا ہے۔ متمدن اور مہذب دُنیا کے بچوں کو یہ آسانی حاصل ہے کہ ان کے ماں باپ اُن کے ہر سوال کا قریباً یہ جواب دیدیا کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ خداوندِ عالم کرتا ہے۔ جس نے ساری دنیا پیدا فرمائی ہے گو ان کی سمجھ میں خداوندِ عالم اور اس کی ہستی بالکل بھی نہ آئے لیکن ان کو ایک گونہ تسکین ضرور ہو جاتی ہے۔ درندوں اور وحشی چوپایوں کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں بسنے والی انسانی آبادی جو ہر قسم کی تہذیب اور ہر قسم کے علم سے محروم ہے۔ اس میں بھی اگرچہ ماں باپ اپنے تجربات سے اپنی اولاد کو مستفید کیا ضرور کرتے ہیں۔ لیکن خود ان کا علم چونکہ بہت ہی محدود ہوتا ہے اور ہر چیز کے متعلق اختلافِ آرا بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس لیے بچوں کا ذوقِ تحقیق بڑی حد تک تشنہ رہ جاتا ہے اور ان کی خاموش تلاش برابر جاری رہتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ کوئی درخت غیر معمولی طور پر بہت ہی بڑا ہے تو فوراً اُنھیں یہ خیال ہوتا ہے۔ کہ وہ سب سے بڑی بااختیار اور صاحبِ قدرت ہستی یہی ہے۔ اسی طرح اثنائے سفر میں کوئی بہت ہی بڑا دریا اگر ان کی راہ میں حائل ہو جائے جس کا کنارہ ہی نظر نہ آئے تو وہ مرعوب ہو کر اسی پر کائنات کے خالق ہونے کا شبہ کر لیتے ہیں اور اس دریا کی طرح اگر کوئی سر بفلک پہاڑ جس میں بڑے بڑے مہیب غار اور خطرناک گہرائیاں ہوں۔ اور جہاں چشموں اور آبشاروں کے بہنے سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی ہو ان کا راستہ روک دے تو ان کا جذبۂ عبودیت زور کرتا ہے۔ اور وہ اس پہاڑ ہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ یوں ہی سورج، چاند، ستارے، آگ، سانپ، مور اور درندے وغیرہ بھی سب اپنی غیر معمولی طاقت اور حیران کُن حُسن کی وجہ سے اس چھوٹے سے انسانی دماغ کو مسحور کر لیتے ہیں اور وہ کبھی ایک کو اپنا پیدا کرنے والا خیال کرتا ہے تو کبھی دوسرے کو اور بعض اوقات اسی تذبذب سے تنگ آکر اس کی محدود اور نامکمل عقل اس سے یہ فیصلہ کرانے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یہ سب کے سب خدا ہیں۔ کیونکہ نا ترقی یافتہ عقلوں کے لیے یہ بہت دشوار ہے کہ کسی ان دیکھی ہستی کا تصور دل میں لائیں اور اس کو اپنا خالق و مالک سمجھیں۔ اس لیے وہ اسی پر اکتفا کرتے اور اپنے جذبۂ عبدیت کو تسکین دے لیتے ہیں۔ کہ کائنات کے اندر جو چیز اُن کو انسان سے قوی اور زیادہ طاقتور یا انسان کے لیے ناقابلِ تسخیر نظر آئے اسی کو اپنا معبود بنالیں اور طرح طرح کے اعمال و قویٰ اُن کی جانب منسوب کر دیں۔

عبادت خواہ محسوس ہستی کی یا نادیدہ غیر محسوس ہستی کی کی جائے یہ چیز سب میں مشترک ہے کہ اس ہستی کو دنیا کا خالق رازق، زندگی بخشنے والا اور فناہ کردینے والا تصور کیا جاتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت میں یہ شوق اور خواہش لے کر پیدا ہوا ہے کہ کسی نہ کسی ہستی کو اپنا مالک، اور اپنا خالق مانے اور ایسی تمام طاقتیں اس کے ساتھ منسوب کردے جو انسان میں نہ پائی جاتی ہوں۔ اسی شوق نے اور اسی خواہش نے بسا اوقات، عام لوگوں کو یا بڑی بڑی انسانی جماعتوں کو اس بات پر بھی مجبور کیا ہے کہ اپنے ہی جیسے اُن انسانوں کے آگے سجدے کیا کریں۔ جو اپنی بعض خوبیوں اور خصوصیتوں میں تمام انسانوں سے ان کو بہتر اور بالاتر نظر آئیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض قوموں نے اَن دیکھے خدا پر ایمان لانے کو مشکل خیال کرکے اس کے تصور کو ہی چھوڑ دیا اور ایک دیکھے ہوئے انسان کو خدا سمجھ کر پوجنے لگے۔ جس نے ان کو سیدھے راستے کی دعوت دی تھی۔ یا خداوندِ عالم کی پرستش سکھائی تھی۔ مہاتما بدھ، کرشن، حضرت مسیح، حضرت عزیر وغیرہ انسان ہونے کے باوجود بہت سے انسانوں کے نزدیک خدا سمجھے گئے اور اُنھوں نے بہت سی صفاتِ الٰہیہ ان کے ساتھ منسوب کردیں۔ حالانکہ خداوندِ عالم کی معرفت کے لیے ہی یہ حضرات تشریف لائے تھے نہ کہ اپنی پرستش ان کی تبلیغ کا مقصود تھا۔ خدائے واحد کی ذات یا صفات میں کسی انسان کو شریک کرنا یا کسی کو **خدا کا عین مظہر** سمجھ کر خدا کی عبادت میں حصہ دار گردانا یا اس کی بحیثیت معبود پرستش کرنا ان ہی راہنماؤں کی تعلیم تھی جس نے مندرجہ بالا تخیل سے انسان کو روکا۔ ہندو مت کے تینتیس کروڑ دیوتے اور ویدانت کے تخیل کا مطمح یعنی ساری کائنات خدا کا وجود ہے اور عیسائیت کے تین اقنوم اسی فریبِ خیال کا ظہور ہیں۔ نہ توحید میں تثلیث اور نہ تثلیث میں توحید بصورتِ ایمان و عقائد سما سکتی ہے۔ اسی نظریہ کی جو عقیدۂ توحید میں غلط انداز پر جم گیا ہے، اصلاح کرنے کے لیے کتاب "جمالِ الٰہی" لکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل عطا فرمائے۔ آمین۔



مذہب اور رُوح کے ابتدائی تصوّرات

مذہب و روح کے مختلف تصورات بالکل ابتدائی معاشرے سے آج تک پائے جاتے ہیں اور جیسے جیسے انسانوں کا قابُو نیچر اور اس کی قوتوں پر بڑھتا جاتا ہے۔ ان تصورات میں بھی نمایاں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ انسان کے بالکل ابتدائی معاشرے میں جب کہ وہ ابھی تک نہ صرف نیچر پر ہی کسی قسم کا قابو حاصل کر چکا تھا بلکہ ہر چیز میں نیچر ہی کا محتاج تھا۔ اس کی زندگی کا سارا دارو مدار نیچر کے رحم و کرم پر تھا۔ اسے غذا اس وقت ملتی تھی جبکہ درختوں میں پھل لگتے یا زمین میں مختلف درختوں کی جڑیں کھانے کے قابل ہو جائیں۔ اس محتاجی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی کا دارومدار انہی درختوں پر ہے۔ اگر وہ پھل دینا بند کر دیں تو وہ بھوکا مر جائے۔ اس خوف کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آہستہ آہستہ ان سے ڈرنے لگے اور ان کا احترام کرنے لگے۔ اور ان کو خوش کرنے کے لیے ناچ اور کھیلوں کی محفلیں منعقد کی جانے لگیں۔ چنانچہ دورِ وحشت کا معاشرہ آج بھی جس دنیا میں موجود ہے وہاں مذہب کی یہی ابتدائی شکل پائی جاتی ہے۔ دورِ وحشت کے آخری دور تک مورتیوں کی پُوجا داخل نہیں ہوئی تھی کہ ان کا مذہب نیچر کی پرستش ہی تھا۔

عہدِ بربریت میں انسان کا اقتدار نیچر کی قوتوں پر کس قدر بڑھا۔ مگر پانی اور زراعت کو ترقی ہوئی تو اس کا اثر مذہبی تصورات پر بھی پڑا۔ اب نیچر اس کی زندگی پر صرف درختوں وغیرہ کی شکل میں اثر انداز نہیں تھی بلکہ اب وہ بارش، دھوپ اور دریاؤں وغیرہ کی مہربانی کا بھی محتاج تھا۔ بغیر بارش کے کاشت ناممکن تھی۔ بغیر اچھی دھوپ کے فصلیں پک نہیں سکتی تھیں اور اس لیے اب اس نے ان قوتوں سے بھی ڈرنا شروع کیا۔ اور ان کو خوش کرنے کے لیے بھی مذہبی تقاریب ہونے لگیں۔ ان کی پُوجا بھی مذہب میں داخل ہو گئی۔ اور اس دور میں انسانی عقل و فہم نے کسی قدر ترقی کی تو اس نے نیچر کی ہر ایک نمایاں قوت کو ایک خدا یا دیوتا کا تصور دیا اور اس کی مُورتیاں بنا کر اُس کی پُوجا کی جانے لگی۔ قدیم ہندو مذہبی فلسفہ یا یُونانی اور مصری اصنام پرستی

انہی ابتدائی مذاہب کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

مذہب کی طرح روح کا تصور دُنیا کی ہر قوم میں موجود ہے اور ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ مذہب خواہ ابتدائی غیر مہذب انسانوں کے ہوں یا ترقی یافتہ مہذب انسانوں کے سب کی بنیاد روحانیت پر ہی قائم کی جاتی ہے۔ روحانی تصورات کے متعلق جب ہم چھان بین کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوچنے والا انسان جبکہ وہ ابھی معاشرے کی ابتدائی منزل میں تھا۔ اس کے سامنے حیاتی مسائل کے دو پہلو بہت ہی غور طلب تھے۔ ایک یہ کہ زندہ اور مُردہ انسان میں کیا فرق ہے اور وہ کونسی چیز ہے جو ان دو کیفیتوں کو ایک دوسرے سے جُدا کرتی ہے اور وہ کونسی چیز ہے جو جانداروں کو سُلاتی جگاتی ہے۔ امراض میں مبتلا کرتی اور مار ڈالتی ہے۔ دوسرے خواب میں جو انسانی شکلیں نظر آتی ہیں اُن کی اصل کیا ہے؟

ان دو مسائل پر جب وحشی اور ابتدائی زمانہ کے بربر غور کرنے لگے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ انسان کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ایک خود اس کی زندگی، دوسرے اُس کا سایہ یا بھُوت ـــ اور دونوں چیزوں کا اس کے جسم سے بہت گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں اس کے جسم سے علیحدہ ہو سکتی ہیں۔ زندگی اس کے جسم سے چلی جائے تو وہ بے ہوش ہو سکتا ہے یا مر سکتا ہے اور اس کا سایہ یا بھُوت اس کی زندگی میں یا مرنے کے بعد اس کے جسم سے علیحدہ ہو کر دوسروں کو نظر آ سکتا ہے۔ چنانچہ خواب میں جو مرے ہوئے یا زندہ لوگ نظر آتے ہیں وہ دراصل ان کا سایہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی ابتدائی تصورات نے آگے چل کر اس مشہور و معروف تصوّر کی صورت اختیار کر لی جس میں روح کے دو اجزاء شیطانی اور غیر شیطانی قرار پاتے ہیں۔ اور اس کی ترقی یافتہ شکل ہمارا موجودہ روح کا تصور ہے۔ ان اعتقادات سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے انسان کی استدلالی اور شعوری قوتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے روح کے متعلق جو تصورات قائم کیے تھے وہ اس زمانہ کے حالات کے مشاہدات اور عام ذہنی اور معاشری ماحول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کس قدر مدلّل تھے۔

عہدِ بربریت میں روح کا جو تصور ترقی پا چکا تھا وہ یہ تھا کہ یہ دراصل بغیر جسامت کے پُتلا انسانی عکس ہے جو انسان میں زندگی کا سبب ہے اور اس میں جو سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے وہ روح میں خود اپنا

احساس اور شعور ہوتا ہے۔ وہ جسم سے نکل کر باہر جا سکتی ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک آن میں پہنچ سکتی ہے۔ اسے نہ چھو سکتے ہیں اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے بیں طبعی طاقت رکھتی ہے اور اکثر نیند میں یا جاگتے ہوئے لوگوں کو جسم سے علیحدہ اور مشابہ نظر آتی ہے۔ اس کا وجود انسان کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ یہ دوسرے حیوانوں بلکہ غیر جاندار اجسام کے جسم میں بھی داخل ہو سکتی ہے اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے کام لے سکتی ہے۔ چونکہ روح کا یہ ابتدائی تصور نظری مشاہدات پر مبنی تھا اس لیے تعلیم و تہذیب کے اس زمانہ میں بھی باقی ہے۔ اگر چہ کہ کلاسکی اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیوں نے اس کی شکل بہت کچھ بدل دی اور جدید علم فلسفہ نے اور بھی اپنی جولانیٔ طبع دکھائی لیکن ابتدائی خدوخال ابھی تک باقی ہیں۔ خاص طور سے قدیم مذہب میں روح کے تصورات عہدِ بربریت کے ان تصورات سے بہت قریب ہیں اور یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ زمانہ بربریت کے فلسفہ کے اثرات زمانہ موجودہ کے فلسفہ اور لغویات پر آج تک موجود ہیں۔

عہدِ بربریت کا یہ خیال آج تک بہت عام ہے کہ روح مرنے کے بعد جسم سے نکل کر آزاد ہو جاتی ہے اور قبر کے اطراف میں چکر لگاتی ہے یا ایک دوسری دُنیا میں دوسری روحوں کے پاس پہنچ جاتی ہے چنانچہ اس عقیدے کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کوئی سردار مرتا تھا تو اکثر قبیلوں میں اس کے غلاموں، بیویوں اور گھوڑے وغیرہ کو بھی قتل کر دیا جاتا تھا تاکہ انکی روحیں آزاد ہو کر سردار کی روح کے ہمرکاب رہیں اور سردار کی روح کی اسی طرح خدمات انجام دیں جسطرح عالم حیات میں وہ دیتے تھے۔ چنانچہ اسکی مثالیں آج بھی جزائر شرق الہند کے کئی قبیلوں میں پائی جاتی ہیں۔

انسانی روح کے تصور کے علاوہ اس دور میں حیوانات اور نباتات میں بھی زندگی اور روح کا تصور پایا جاتا ہے۔ امریکہ میں بعض قبائل سانپ اور اس قسم کے دوسرے جانوروں کا انکے مرنے کے بعد بڑا احترام کرتے ہیں کہ انکی روحیں کہیں بدلہ نہ لیں۔ اس خوف سے نذرانے پیش کرتے ہیں اور بعض جگہ پوجا بھی کی جاتی ہے۔ افریقہ کے بعض قبائل جب ہاتھی کا شکار کرتے ہیں تو اُس کے مرنے کے بعد اسکے اطراف میں جمع ہو کر اس سے معافی مانگتے ہیں اور اُسکی سونڈ گاڑ دیتے ہیں کہ کہیں وہ بدلہ نہ لے۔ کوئی کانگو اگر حمد اً کسی وحشی جانور کو مار دیتا ہے تو اس کے ساتھی اس سے بدلہ لیتے ہیں۔ اسطرح کے تصورات درختوں اور بعض قبیلوں میں جمادات وغیرہ کے متعلق پائے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماج میں پتھروں، درختوں اور جانوروں کی پوجا داخل ہو گئی جس کی مختلف اور بدلی ہوئی شکلیں آج بھی پائی جاتی ہیں۔

ایمان کی حقیقت

اسلام نے عقائدِ صحیحہ کے ماتحت نو حقائق کو تسلیم کر لینے کی تلقین فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتلایا ہے کہ ان حقائق کو صرف تسلیم کر لینا نجاتِ اخروی کے لیے تو کافی ہے مگر ان کا زاید سے زاید اثر اور فائدہ اسی وقت ظاہر ہوگا جبکہ ان حقائق کی مثالوں کو سامنے رکھ کر ان کی اعلیٰ و ارفع صفات کی تقلید اور اتباع کیا جائے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسی فعلِ قلبی یعنی تسلیم کا نام ایمان لانا ہے۔ گویا شریعت کی زبان اور قرآنی اصطلاح میں مطلق و کامل ایمان کی تعریف یہ ہوئی کہ ایمان کسی حقیقت کو دل سے مان لینے، زبان سے اقرار کر لینے اور اس حقیقت کے اعلیٰ صفات کو اپنے وجود کے اندر پیدا کرنے کی غرض سے عملاً ان صفات کی تقلید کرنے اور اتباع کا نام ہے اور وہ نو۹ حقائقِ ایمانیہ یہ ہیں:-

۱- وجودِ باری تعالیٰ کا اقرار و اعتراف۔

۲- وجودِ ملائکہ کی تسلیم۔

۳- کُتبِ الہامیہ کا اقرار و اذعان۔

۴- تمام انبیاء و مرسلین کی تصدیق۔

۵- قیامت یا روزِ جزا کا یقین۔

۶- خداوندِ عالم جل و علا شانہٗ کی طرف سے نیکی و بدی کے اندازہ کرنے کا اعتقاد جس کو مسئلہ تقدیر کہتے ہیں، یعنی یہ ایمان رکھنا کہ خیر و شر دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔

۷- موت کے بعد زندہ ہونے کا اقرار۔

۸- جنت کا یقین رکھنا۔

۹۔ دوزخ کا اعتقاد، یعنی جنّت و دوزخ دونوں کا وجود خارج میں تسلیم کرنا۔

دوسرے الفاظ میں حقیقتِ ایمان کی وضاحت ان الفاظ میں سمجھئے کہ ایمان عربی زبان کا مصدر ہے جس کے معنی ماننے، پناہ دینے، بے خوف کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں ایمانِ کامل سے مراد اقرارِ لسانی اور تصدیقِ قلبی جو کسی نبی کی تعلیم کی نسبت ظاہر کی جائے اور قلبی انشراح کے ساتھ محض تقویٰ کے لحاظ سے صرف نیک نیتی کی بنیاد پر نبیؐ کی فرمودہ باتوں کو تسلیم کیا جائے۔ یعنی ایمان تصدیقِ قلبی سے عبارت ہے اور اقرارِ لسانی جمہور محققین کے نزدیک شرطِ ایمان ہے مگر اس امر میں کہ اعمال و افعال حقیقتِ ایمان میں داخل ہیں یا خارج۔ محققین میں قدیم زمانہ سے اختلاف چلا آیا ہے جس کی وضاحت ان اقوال سے ہوتی ہے۔ علامہ اصفہانی لکھتے ہیں کہ تصدیق رسول علیہ السّلام سے ان تمام چیزوں کا یقین و اعتقاد مراد ہے جن کا خداوندِ عالم کی طرف سے لانا صراحتاً و ضرورتاً آپ سے ثابت ہو۔ جیسے پانچ نمازوں کی اور روزہ کی فرضیت، شراب و زنا کا حرام ہونا ہر دو کلمے شہادتین واجبات کے بجا لانے اور عام محرمات سے پرہیز کرنے وغیرہ وغیرہ۔ اسی واسطے اکثر متقدمین نے فرمایا ہے کہ ایمان تصدیقِ قلب، اقرارِ لسان اور عمل بالارکان سے عبارت ہے اور اسی کی شرح میں رومی نے بعد ذکرِ اختلافِ مذاہب کے لکھا ہے کہ تیسرا قول محققین کا یہی ہے کہ ایمانِ کامل تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا مجموعہ ہے اور اسی طرح حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب نہایت العقول میں لکھا ہے کہ اگر ایمان اعمالِ قلب، و اعضاء کا نام ہو تو جو لوگ ایمان کو تصدیقِ قلبی اقرارِ لسانی اور کارِ اعضائی سے تعبیر کرتے ہیں وہی حق پر ہیں اور یہی مذہب اکثر متقدمین کا ہے۔ ایسے ہی سید شریف صاحب جرجانی رحمۃ اللہ علیہ شرحِ مواقف میں فرماتے ہیں کہ بعض متقدمین ابنِ مجاہد وغیرہ نے فرمایا کہ ایمان تصدیقِ قلب، اقرارِ لسان اور عمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور مذاق العارفین میں ہے کہ وہ ایمان جس کا نتیجہ دوزخ سے نجات پانا ہے، دل سے یقین اور زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کرنا کہلاتا ہے اور زمانہ سابق کے متقدمین ایمان اور عمل کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ پس اس بحث سے معلوم ہوگیا ہے کہ علمائے حنفیہ کا مسلک یہی ہے کہ ایمانِ کامل تصدیق بالقلب مع کلماتِ شہادتین کا نام ہے اور یہی سیدنا امام ابو حنیفہ سے مروی ہے

یہی یہ بات کہ مندرجہ بالا حقائق ایمانیہ کا خواہ اقرار تفصیلی کیا جائے یا اجمالی ہر مسلمان کو اختیار ہے۔ مگر ان حقائق میں سے دو حقیقتیں یعنی وحدانیت اور رسالت (جس رسالت سے مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تامہ کی تصدیق ہے) اصولی اور اہم عقائد ہیں۔ ان دونوں کی تصدیق اور اقرار میں بالتبع باقی تمام حقائق آجاتے ہیں۔

ایمان مفصل یہ ہے کہ کوئی مومن ان الفاظ میں اقرار کرے کہ میں اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر، نیکی و بدی کے اندازہ کرنے پر اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان لایا ہوں۔ اور ایمان مجمل یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر جیسا کہ وہ اپنی ذات وصفات میں ہے ایمان لایا اور اس کے تمام احکام کو زبان و دل سے قبول کیا۔ اگرچہ ایمان مجمل بھی نجات کے لیے اور اسلامی فریضہ سے عہدہ برآء ہونے کے لیے کافی ہے مگر تفصیلی ایمان افضل اور اعلیٰ ہے اور ایمان مجمل سے اس کا درجہ بہت زیادہ ہے۔

حقائق ایمانیہ کی تشریح و تعبیر میں وہی قول معتبر ہوگا جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قول صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے مطابق ہو۔ کسی کا اپنی طرف سے کوئی مفہوم متعین کر لینا ہرگز صحیح اور قابل قبول نہیں ہوگا اور نہ عقل ونقل کی مطابقت میں موجودہ علوم سے مرعوب و مسحور ہو کر کوئی تاویل قابل عمل ہوگی۔ جیسا کہ بعض مغربی تعلیم یافتہ حضرات کا وطیرہ ہے۔ یہ اس لیے کہ ان حقائق کا مفہوم شریعت میں متعین ہو چکا ہے اور اب اس کے خلاف تاویلات رقیقہ باطلہ سے کام لینا سراسر گمراہی ہے۔

ہاں ان کی حقیقت اور کُنہ تک رسائی و یقین حاصل کرنے کے لیے چھان بین کوئی مذموم فعل نہیں اور نہ شک وجہل کا ازالہ علم بصیرت سے گناہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام کی تمام تعلیم تعین بُرہان پر مبنی ہے اور فطرت کو طمانیت بخشتی ہے۔

ایمان باللہ جلّ شانہٗ

چونکہ اعمال کی درستی کا انحصار عقائد کی صحت پر ہے اور اکثر مسلمان ایسے ہیں کہ اصولِ مذہب سے آگاہ نہیں لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے صحیح عقائد کے بیان کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے مالک وخالق کی شانِ ارفع واعلیٰ کیا ہے اور اس کی ذات وصفات پر ہمیں کیونکر ایمان رکھنا چاہیئے اُن کے اعمالِ صالحہ کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہوگی۔ خصوصاً اس پُرآشوب زمانہ میں جبکہ بے شمار گندم نما جو فروش رہنمائی کا لبادہ اوڑھ کر عوام کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالنے میں جابجا نظر آتے ہیں، جو خود توحقیقتِ ایمان واسلام سے علاقہ نہیں رکھتے مگر ناواقف مسلمانوں کو دامِ تزویر میں پھانسنے پر بڑے مشاق ہیں۔ انہوں نے ربّ العزت جلّ وعلا شانہٗ کی شانِ بلند وبالا میں ایسے عقائد وضع کر لیے ہیں جن پر ایمانی غیرت بزور نفرین کرتی ہے۔ ان کے عقائدِ باطلہ معبودِ حقیقی کی حقیقت جاننے میں ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا وہ خداوندِ عالم عزّوجل کا کوئی نہایت ہی بے اصل اور بے حد کمزور سا تخیل رکھتے ہیں جس کے شان میں منسوب بکذب کرنا بھی ناممکن نہیں سمجھتے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

اس لیے اعمال سے قبل ضرورت ہے کہ مندرجہ ذیل صحیح عقائد پر مستقیم ہو لیا جائے۔ تاکہ پھر اعمالِ صالحہ کی حقیقت کوئی رنگ لا سکے اور وہ یہ ہیں کہ:۔

اللہ تعالیٰ ایک ہے، وحدہٗ لاشریک ہے۔ ذات وصفات، افعال واحکام اور اسمارِ حسنیٰ میں واجب الوجود ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ یعنی اس کا وجود ضروری اور عدم محال ہے۔ وہ ازلی وابدی (قدیم) ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت و پرستش کی جائے۔ وہ بے پرواہ ہے۔ قطعاً کسی کا محتاج نہیں۔ اس کی ذات کا ادراک عقلاً محال ہے

کیونکہ جو چیز سمجھ میں آسکتی ہے عقل اُسی کو محیط ہوتی ہے اور اس کی ذات کو کوئی احاطہ نہیں کر سکتا البتہ اس کے افعال کے ذریعے سے اجمالاً اس کی صفات پھر اُن صفات کے ذریعے سے معرفتِ ذات حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تمام صفات نہ عین ہیں نہ غیر۔ یعنی صفات اسی ذات ہی کا نام نہیں اور نہ کسی طرح اس سے بحوِ وجود میں جدا ہو سکیں کہ نفسِ ذات کی مقتضی ہیں۔ اور عین ذات کو لازم، جیسے اس کی ذات قدیم ازلی و ابدی ہے صفات بھی قدیم ازلی و ابدی ہیں۔ نہ مخلوق ہیں نہ زیرِ قدرت داخل۔ اور ذات و صفات کے سوا سب اشیاء حادث ہیں۔ یعنی پہلے نہ تھیں پھر موجود ہوئیں۔ صفاتِ الٰہی کو مخلوق کہنا یا حادث سمجھنا گمراہی ہے اللہ تعالیٰ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ بیوی نہ ہم جنس۔ وہ حیّ ہے یعنی خود ایسا زندہ جس کے ہاتھ میں سب کی زندگیاں ہیں جس کو جب چاہے زندہ فرما دے اور جب چاہے موت دے دے۔ وہ ہر ممکن پر قادر ہے۔ کوئی ممکن اس کی قدرت سے باہر نہیں اور جو چیز محال ہے اللہ جلّ شانہٗ کی ذات اس سے پاک ہے۔ محال اسکو کہتے ہیں جو موجود نہ ہو سکے۔ مثلاً دوسرا خدا محال ہے یعنی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر زیرِ قدرت ہو تو موجود ہو سکے گا۔ اور موجود محال نہ رہا اور اس کو محال نہ ماننا وحدانیت کا انکار ہے۔ حیات، قدرت، سمع، بصر، کلام، علم، ارادہ اسکی صفاتِ ذاتیہ ہیں۔ مگر کان، آنکھ، زبان سے اس کا سننا، دیکھنا، کلام کرنا نہیں۔ کیونکہ یہ سب اجسام ہیں اور اجسام سے وہ پاک ہے۔ ربّ العزّت کا کلام بھی مثل دوسری صفات کے قدیم ہے۔ حادث اور مخلوق نہیں۔ اس کی ذات غیب و شہادت سب کو جانتی ہے۔ علمِ ذاتی اس کا خاصہ ہے اور ہر شئے کو محیط یعنی جزئیات کلیات، موجودات، معدومات، ممکنات و محالات سب کو ازل سے جانتا ہے۔ وہی ہر شئے کا خالق ہے اور وہی رازق۔ ملائکہ وغیرہ وسائل اور ذرائع ہیں۔ ہر بھلائی اور برائی اس نے اپنے علمِ ازل کے موافق مقدّر فرما دی ہے۔ یعنی جیسا ہونے والا تھا اور جیسا کرنے والا تھا اس نے اپنے علم سے جانا اور لکھ دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو اس نے لکھ دیا ویسا ہی ہم کو کرنا پڑتا ہے، بلکہ جیسا ہم کرنے والے تھے ویسا اس نے لکھ دیا۔ اور اس کا علمِ غیب اسی سے متعلق ہے۔ یہ مسئلہ قضا و قدر چونکہ عموماً انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ اس لیے اس میں بحث کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ مختصر طور پر اتنا سمجھنا

کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو پتھر اور دیگر جمادات کی طرح بے حس و حرکت پیدا نہیں فرمایا۔ بلکہ ایک لحاظ سے اسکو اختیار دیا ہے کہ کسی کو کچھ کرنا یا نہ کرنا اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ چاہے کرے، نہ چاہے نہ کرے اور اس کے ساتھ ہی عقل بھی دی ہے کہ بھلے اور بُرے کی پہچان کر سکے۔ اس حال میں اپنے آپ کو بالکل مجبور یا بالکل مختار سمجھنا ایمانی حیثیت سے دونوں گمراہی ہیں۔ اللہ عزّ و جل جہت و مکان و زمان و حرکت و سکون و شکل و صورت جمیع حوادث سے پاک ہے۔ دنیوی زندگی میں دیدارِ الٰہی حضور نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے خاص ہے۔ اور آخرت میں ہر اہل سنت والجماعت اور صحیح الایمان مسلمان کے لیے ممکن و واقع۔ ہاں قلبی اور خوابی دیدارِ باری تعالیٰ دیگر تمام انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کے لیے بھی حاصل ہے۔ جیسے کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ نے خواب میں اپنے مولا کریم کو کئی بار دیکھا۔ خالق الکل کا دیدار بلا کیف ہے۔ یعنی دیکھیں گے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کیسے دیکھیں گے۔ جس چیز کو دیکھتے ہیں اس سے سافت کا کچھ فیصلہ ہوتا ہے۔ خواہ نزدیک ہو یا دُور اور وہ دیکھنے والے سے کسی جہت میں اوپر یا نیچے، دائیں یا بائیں، آگے یا پیچھے ہوتی ہے مگر باری تعالیٰ کا دیکھنا ان تمام باتوں سے پاک ہوگا۔ باقی رہا یہ کہ کیونکر ہوگا۔ اس کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس مقام پر "کیونکر" کو دخل نہیں۔ انشاء اللہ جب دیکھیں گے دکھا دیں گے۔ یعنی "کیونکر" کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ یہ عقل سے متعلق باتیں اس میدان میں کام نہیں دیتیں اس لیے کہ جہاں تک عقل پہنچتی ہے وہ خدا نہیں اور جہاں خدا ہے۔ وہاں تک عقلِ نارسا کی رسائی نہیں یا یوں سمجھئے کہ نیچے اوپر دائیں بائیں چونکہ اس عالمِ امکان کے حالات ہیں جو کہ ختم ہو چکا۔ عالمِ آخرت میں دیکھنا ان وسائل و اسباب کا محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جیسا چاہے کرے کسی کو اس پر اختیار و دخل نہیں اور نہ کوئی اس کے ارادے سے اُسے باز رکھنے والا ہے۔ اس کو نیند اور اونگھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ تمام جہان کا وہی نگاہ رکھنے والا ہے۔ تمام کائنات کا رب (پالنے والا) اور ماں باپ سے زیادہ حلیم اور مہربانی فرمانے والا ہے۔ اسی کی رحمت ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا اور وہی ہر بڑائی اور عظمت کا مالک ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچوں کا صورت گر اور پرورش کرنے والا، گنہ گاروں

کے گناہ بخشنے والا اور ہر تائب کی توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ عزیز و ذلیل کرنا، مقبول و مردود بنانا، عطا کرنا اور نعمت کا چھیننا سب اسکی قدرت میں داخل ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا آئندہ کرے گا سب بہ تقاضائے حکمت اور عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ وہ سب کو محیط ہے۔ اس کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہر قسم کا نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ ایسے کام کا حکم نہیں فرماتا۔ جو بندے کی طاقت سے باہر ہو۔ بندے کے ساتھ لطف و مہربانی یا وہ کرنا جو اس کے حق میں بہتر ہو، اس پر کچھ واجب نہیں کیونکہ وہ مالک علی الاطلاق ہے جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے۔ ہاں اس نے اپنے کرم سے وعدہ فرمالیا ہے کہ مسلمانوں کو جنّت میں داخل فرمائے گا۔ اور بمقتضاء عدل کفّار کو جہنّم میں۔ اور اس کے وعدہ و وعید مطلق ہرگز تبدیل نہیں ہوتے۔ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ خواہ وہ حکمت بندہ کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ اور اس کے فعل کے لیے کوئی اپنی غرض نہیں کیونکہ غرض اس فائدہ کو کہتے ہیں جو کہ فاعل کی جانب رجوع کرے۔ نہ اس کے افعال علت و سبب کے محتاج ہیں۔ اس نے اپنی حکمت بالغہ کے مطابق عالم اسباب میں مسبّبات کو اسباب سے مربوط فرمایا ہے۔ کہ عموماً اسباب کے اختیار کرنے پر وہ تاثیر پیدا کرتا ہے جس سے مسبب معرضِ وجود میں آجاتا ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، آگ جلاتی ہے۔ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو آنکھ سنے، کان دیکھے، پانی جلائے اور آگ پیاس بجھائے۔ نہ چاہے تو کچھ بھی نہ ہو۔ کس قہر کی آگ تھی جس میں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو ڈالا۔ مگر مالک الملک کی مرضی نہ جلنے دینے کی تھی۔ گلزار اور سلامتی کی ٹھنڈی کر دی گئی۔ ابراہیم علیہ السّلام کا یہ ایمان کہ اظہار احتیاج سے بھی پرہیز اور مالک الملک کا یہ انعام کہ تسکین کا پیغام بھی بھیجنے کی ضرورت نہیں خیال فرمائی۔ براہِ راست آگ کو حکم پہنچا اور گلزار ہو گئی۔ کیسی تیزی اور حدت۔ کہاں کا جلنا اور جلانا فاطرِ فطرت کا حکم اپنی حکمتوں کا ایسا ثبوت دے گیا۔ جس سے انسان کے صحیح تعلّق اور خالق الکل کے وعدوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ"



مسلکِ اہلسنّت

اسلام میں جس قدر فرقے ہوئے اور جو اب بھی صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے موجود ہیں، ان کی ضلالت اور گمراہی کا سبب صرف یہ ہوا ہے کہ انھوں نے معتقدات میں ایسے امور کی تفصیل چاہی جن سے قرآنِ کریم نے سکوت سے کام لیا اور اپنے ماننے والوں کو اجمال سے آگے نہیں جانے دیا بلکہ یوں سمجھئے کہ خود بانیٔ اسلام ہادیٔ کل کائنات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کی تشریح نہیں فرمائی تھی۔ انہوں نے غیر مادی اور غیر محسوس اشیاء و اوامر کی نسبت سوالات و اعتراضات کی بھرمار کردی اور ان اسرارِ سربستہ اور عقدہ ہائے لاینحل کی گرہ کشائی میں اپنی تمام دماغی قوت خرچ کر ڈالی جن کی تحلیل عقلِ انسانی کے فہم وادراک سے باہر تھی اور جن کا علم ایسے نادانوں کی عملی زندگی کے لیے محض بے سود تھا۔ اگر وہ ایمان والیقان اپنے اندر پیدا کر لیتے اور رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کے درجۂ عالیہ پر فائز ہو جاتے تو صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکتے۔ وہ یہ بھی نہ جان سکے کہ ایمان بالغیب کی حقیقت یہی تو ہے کہ عقل میں نہ آنیوالے اوامر اس بات کے مقتضی ہیں کہ ان پر بغیر قیاس آرائیوں اور احساس شناسیوں کے ایمان رکھا جائے اور ایمان کی منازل میں کوئی وقت ایسا بھی آجائے جب ایمان بالغیب غلط نظر آنے لگے۔ اس نکتہ کو فقہاء اہلسنّت نے روزِ اوّل ہی سے سمجھ لیا تھا کہ:-

۱۔ داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد و اعمال کے متعلق جو کچھ بھی تعلیم وتلقین اپنی امتِ وسطیٰ کو فرما دی ہے۔ اس میں ایک ذرہ بھر بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ عقائد اور خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ کی ذات وصفات کے متعلق قرآنِ کریم نے جو کچھ بیان فرمایا، یا حضور علیہ السلام نے جو ارشاد کر دیا اور جس مسئلہ کی جس حد تک قرآن نے تشریح کی ہے۔ صرف اسی پر

ایمان لانا واجب ہے - اپنی عقل و قیاس اور استنباط سے اس کی تشریح و تفسیر کرنا صحیح نہیں اور نہ اس پر ایمان لانا اسلام کی صحت کے لیے ضروری ہے - بلکہ ممکن ہے کہ وہ گمراہی اور ضلالت کا موجب ہو جائے - حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ میں اور میرے ہمعصر علماء عقائد کی گہرائیوں میں جانا اور اس باب میں کسی قسم کی گفتگو کرنا ناپسند فرماتے رہے ہیں اور بالخصوص مسئلہ جبر و قدر میں تو شدت سے ممانعت برتنا ان کا شیوہ رہا ہے - میں جن امور کے تحت ہیں کوئی عمل ہو بحث کرنا پسند نہیں کرتا - اور وہ عقائد بالخصوص میرے لیے سکوت پسند ہیں جن میں خداوند عالم جلّ وعلا شانہٗ کی ذات پر بحث و تحمیص کا منہ کھولنا مقصود ہو - کیونکہ ان مسائل میں تاویلات سے کام لینا جو نہ سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور نہ کسی صحابی سے صحیح طریقہ سے مروی ہوں - ایک معیوب بات ہے - رب العزّت جلّ وعلا شانہٗ کی جانب سے سرکارِ دو عالم علیہ السّلام کو ارشاد تھا کہ جو کچھ آپ پر نازل ہو وہی کچھ لوگوں کو پہنچائیے - گویا ایمان اسی طرح لانا چاہیئے جس طرح خدا کی مرضی ہو - حضرات بزرگانِ دین نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ خداوندِ عالم اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ عقل اور حواس سے دریافت ہو سکے - یا اس میں صفات اس طرح موجود ہوں کہ جس طرح عوارض جواہر میں ہو کر پائی جاتی ہیں - یا وہ اس طرح ہوں جن کو عام عقلیں ادراک کر سکیں - یا متعارف الفاظ ان کو ادا کر سکیں - صاحب کتاب الاسلام لکھتے ہیں کہ با ایں ہمہ پھر بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بتا بھی دیے جائیں - تاکہ جہاں تک انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے ہو جائے - ایسی حالت میں اس سے چارہ نہیں کہ ان صفات کا استعمال ان معنوں میں کیا جائے کہ ان کے نتائج اور لوازم سمجھ لیے جائیں - مثلاً ہم خداوندِ عالم کے لیے رحمت ثابت کرتے ہیں - اس سے مقصود احسانات کا فیضان ہے - دل کی خاص کیفیت نہیں اس طریقے سے خدا کی وسعتِ قدرت کے اظہار کے لیے مجبوراً ہم کو وہ الفاظ استعارۃً استعمال کرنے پڑیں گے جو انسانوں کی قوّت و قدرت کے لیے بولے جاتے ہیں - کیونکہ ان معانی کے ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس اس سے بہتر الفاظ نہیں اور اسی طرح تشبیہاً بھی بہت سے الفاظ بولے جائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے حقیقی معنی مراد نہ ہوں بلکہ وہ معانی جو خدا کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ صفات اسی طریقے پر بولے گئے ہیں - اور اس پر کہ یہ الفاظ اسی طرح بولے جائیں اور اس کے علاوہ کوئی اور بحث اور کاوش نہ کی جائے - اور یہی مذہب

اس زمانہ کا تھا جس کی خیر و برکت کی شہادت دی گئی ہے۔ اس کے بعد کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے جنھوں نے بغیر کسی نصِ قطعی اور دلیلِ محکم کے ان مسائل میں فکر و کاوش شروع کر دی۔ الغرض علماءِ اہلِ سنّت کا شروع سے یہ اعتقاد اور مسلک رہا ہے کہ حضرت خداوندِ عالم جلّ مجدہٗ نے دین کے متعلق جو کچھ فرمانا تھا وہ اپنے محبوب محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زبانی انسانوں تک پہنچا دیا اور عقائد کی جو تفہیم و تشریح داعیٔ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمانی تھی فرما دی۔ اب دین میں نئے نئے مسائل اور عقائد کے متعلق نئی نئی بحثیں اور کاوشیں داخل نہ ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بالآخر بے راہ روی اور گمراہی ہے۔

لیکن جب طبیعتوں میں کرید اور ٹوہ کا مادہ زیادہ پیدا ہو گیا اور دین میں فلسفہ کی آمیزش سے الحاد پھیلنے لگا جیسا کہ فی زمانہ بدعقیدہ راہنماؤں کے فتنہ سے اسلامی عقائد متزلزل ہو رہے ہیں اور نئی نئی قسم کی بحثیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایسی حالت میں شکوک و اوہام کی روک تھام اور تحفظِ اسلام کے لیے ضروری تھا کہ اہلسنّت بھی عقائد کی بحثوں میں نفیاً یا اثباتاً کوئی پہلو اختیار کرتے۔ کیونکہ ایسے وقت میں عام فرقہ بندی، ہنگامہ آرائی اور عقل و نقل کی جنگ میں سکوت کرنا یقیناً حقیقتِ اسلام کو گم ہوتے دیکھ کر رضامندی کا اظہار کرنا تھا۔ مخالفین کا اسلام کے سینے کو اعتراضات سے چھلنی کرتے دیکھ کر اہلِ سنّت مجبوراً اثباتِ عقائد و تحفظِ اسلام کے لیے آگے بڑھے اور مخالفین کے مقابلے میں پورا پورا حق ادا کیا اور اس ضرورت سے اُنھوں نے اپنے مسلک کو قائم رکھتے ہوئے اپنے مذہب کو قواعدِ عقلی کے مطابق بنانے کی کوشش شروع کر دی اور فلسفہ و شریعت کی تطبیق میں معقولات کے بڑے بڑے معرکے سر ہو گئے۔

فقیر کی اس تمام تر تحریر کا ماحصل یہ ہے کہ شارع نے ہمیں جہاں تک مذہب میں چھان بین اور تحقیق و تدقیق کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہاں تک ہمیں عقل سے کام لینا چاہیئے یعنی جو چیز سمجھ میں آنے کے لائق ہے اس کو تحقیق کر کے مان لینا چاہیئے اور جو چیز ہماری عقل سے بالاتر ہے اور سمجھ میں نہیں آتی اس کے واقع میں ہونے کی نفی ہی نہیں کر دینی چاہیئے بلکہ عقل کی انتہائی پرواز کے مقام پر پہنچ کر وحی و الہامِ الٰہی کے سامنے سرنگوں ہونا چاہیئے کیونکہ جو عقل حقائقِ اشیاء کے ادراک کی ایک محدود قوت رکھتی ہے

وہ الٰہیات کی کُنہ کو کیا خاک پہنچے گی وہ تو ابھی ان روزمرّہ مشاہدے میں آنے والی مادی اشیاء کی حقیقت کو بھی نہیں پا سکتی۔ اگر عقل کوئی مستقل چیز ہوتی تو عقلائے زمانہ میں اختلاف نہ ہوتا۔ نیز یہ کہ عقلی دلائل اور فلسفی تحقیقات خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں شک و شبہ اور غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتیں۔ اور یہ بھی کہ کیا عقلائے زمانہ کی آنکھوں نے ان تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جو نظر آ سکتی ہیں۔ یا ان کے حواس اور قوتوں نے مقدورات اور اشیائے عالم کا پورا پورا احاطہ کر لیا ہے۔ اور کیا ان کی عقلی قوت کو ساری معلومات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہو گیا ہے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ خداوندِ عالم کی ذات و صفات کے مسائل اور اسرارِ نبوّت کو بھی اپنی عقل کے دو انچی گز سے ناپ لینا چاہتے ہیں اور اس بات پر حریص ہیں کہ حقائقِ اشیاء میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو ان کی دسترس سے اچھوتی ہو۔

پس اہلِ سنّت کا مسلک اور ہمارا مدعا یہ ہے کہ ارتقاء کا آخری مرتبہ اور منزل عقل نہیں۔ جیسا کہ عقل کے بندے سمجھتے ہیں بلکہ ارتقاء کی آخری منزل وحئِ الٰہی اور سرکارِ دو عالم سیّد کون و مکان محمّد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ارشادات ہیں۔ یعنی نورِ عقل کے لیے نورِ نبوّت کی ضرورت ہے اور ملکوتی اسرار اور دقائقِ نبوّت کا ادراک مجاہدات و ریاضات سے ہی ہو سکتا ہے۔



منکرینِ خدا

پچھلی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کی ہستی پر ایمان لانا اور اس کی بارگاہ میں سرِ نیاز جھکانا انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اور جو معدودے چند انسان سرے سے خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔ وہ صحیح الفطرت انسان نہیں ہیں۔ وہ اپنی فطرت کی راہنمائی کے بجائے اپنی محدود عقل کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ چونکہ ان کے حواس ایک بڑی حد تک نامکمل اور اُن کی عقلیں بہت کچھ ناقص ہیں۔ اس لیے ہمیشہ وہی ان کی گمراہی کا باعث بنتی ہیں۔ اور ہر ایسی ہستی کے وجود سے قطعاً انکار کر دیتے ہیں جس کا وجود اُن کی عقول سے بالاتر ہو اور جس کی قدرت وطاقت اُن کی دلیلوں کے ذریعے سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکے۔

ایسے منکروں کے اعتراضات کا ذخیرہ صرف ان الفاظ پر قائم ہے کہ اگر خدا کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایک واقعہ جو آج پیش آیا اسکی علت قدیم ہوگی یا حادث۔ اگر قدیم ہے تو لازم آئے گا کہ یہ واقعہ بھی قدیم اور ازلی ہو۔ کیونکہ علت کے ساتھ معلول کا وجود لازم ہے۔ اور اگر حادث ہو تو اس علت کی علت بھی حادث ہوگی۔ اور پھر اس کے لیے کوئی اور علت درکار ہوگی۔ اب اگر یہ سلسلہ کسی ایسی علت پر جا کر ختم ہو جو قدیم اور ازلی ہے تو اِس تمام سلسلہ کا درجہ بدرجہ قدیم ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ جب علت العلل قدیم ہے تو اس کا پہلا معلول قدیم ہوگا۔ اور جب پہلا معلول قدیم ہے تو اس کا دوسرا معلول بھی قدیم ہوگا۔ اگر یہ سلسلہ قدیم اور ازلی علت پر ختم نہیں ہوتا بلکہ الیٰ غیر النہایت چلا جاتا ہو تو خدا کہاں باقی رہتا ہے۔

پھر فلسفۂ جدید کے مرید یہ کہتے ہیں کہ اس عالمِ ارضی و سماوی اشیاء کی اصل دو چیزیں ہیں۔ مادہ اور اس کی قوت (حرکت) یہ دونوں قدیم اور ہمیشہ سے ہیں۔ ازل سے ان میں تلازم پایا جاتا ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ مادہ اور اسکی قوت میں انفکاک و انفصال (علیحدگی) ہو سکے۔ اور ان دونوں میں سے کوئی بغیر دوسرے

کے پایا جاسکے۔ مادہ سے مُراد یہی ایتھر ہے جو خلا میں بھرا ہوا ہے اور قوت سے مراد اُس کے غیر منقسم اجزا کی حرکت ہے جو کہ اپنی ذات کے اعتبار سے مختلف اشکال بدلتی رہتی ہے۔ یہ حرکت مادہ میں خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے کوئی بھی خارجی سبب اس کی حرکت کا باعث نہیں ہوتا۔ پھر اجرام سماوی یعنی ستارے وغیرہ اور کائنات ارضی جمادات، نباتات اور حیوانات اس مادہ سے بذریعہ حرکت بن گئے ہیں۔ اشیاء کی پیدائش میں مادہ اور اسکی حرکت کو نہ کسی قسم کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ان میں قصد ہی پایا جاتا ہے۔

گویا منکرین خدا کے مذہب کی یہ پونجی ہے کہ چونکہ وہ مادہ کو قدیم مانتے ہیں۔ اس لیے خداوند عالم جلّشانہ کے وجود کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے جو مادہ کو پیدا کرتا ہے اور جب انہوں نے مادہ کے ارضی وسماوی تنوعات کو دیکھا اور ان کا حادث ہونا بھی ان کے نزدیک ثابت ہوگیا تو ان کو ضرورت لاحق ہوئی کہ مادہ کے حرکات بسیط کے لیے حرکت ثابت کریں۔ اس طرح انھوں نے تمام تنوعات کو مادہ اور اس کی حرکت پر مبنی کیا کاش کہ وہ مادہ کا حدوث مان لیتے تو ان کو اتنی دردسری کی ضرورت نہ ہوتی اور وہ ضرور وجودِ خدا کے قائل ہوجاتے مگر یہ نہ ہوا۔

اور یہ لوگ مدتوں مادہ اور اس کی قوت کی بھول بھلیاں میں پھنسے رہے۔ شک وریب کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانا اور ایک تاریکی سے نکلنے کے لیے دوسری تاریکی میں ڈوب جانا انہوں نے اپنی فطرت ثانیہ بنا لی اور اس دنیا کو قدیم اور باقی سمجھتے رہے پھر اس میں تغیر پیدا ہوا تو گو مادہ اور اسکی قوت کو قدیم سمجھا مگر تحقیقات جدیدہ کے سہارے نظام عالم کا حادث اور متغیر ہونا ثابت کرنے لگے اور ساتھ ہی مادی اجسام کی حقیقت ماہیت اور صورت میں بھی کچھ فرق ہوگیا۔ پہلے چار عنصروں کا اقرار تھا۔ اب بہتر[۷۲] مارے جانے لگے اس کے بعد پھر ان میں کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ ہوئی تو آخر یہ تعداد غیر معین ہوگئی یہاں تک کہ اکابر فلاسفہ کا خیال ہوگیا کہ غالباً یہ تمام مادہ اور قوت اپنی گوناگونی کے باوجود بھی ایک ہی حرکت کی مختلف کیفیتوں کا نام ہے۔ پھر سائنس نے سیاروں اور ستاروں کی ماہیت معلوم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور صرف قیاسات عقلی کی بنا پر فتویٰ دے دیا کہ مادہ ہر جگہ یکساں ہے۔ الغرض یہ سب کچھ ہوا مگر وہی نہ ہوا جس کا جواب خدا پرست مانگتے تھے اور انکی عقلیں سمیوتی خصلت لیے ہوئے ایک حد تک پہنچ کر رک

گئیں اور ان کو نہ مادے اور اس کی قوت کی اصل حقیقت معلوم ہوئی نہ انہوں نے وقت اور جگہ کا صحیح مفہوم سمجھا اور نہ اس کی زندگی کی ابتدا اور حیات کی ماہیت کا سراغ ملا۔ یہانتک کہ خود اپنے دماغ کی بہت سی مخفی طاقتوں اور پوشیدہ قابلیتوں کے جاننے سے بھی قاصر رہے۔ جیسے ان کا مادہ لاعقل، بہرا اور گونگا تھا اسی طرح یہ اس کے بندے بھی ساکت وسامت اور "صم بکم" ہو کر رہ گئے اور ان تمام مسائل کے جواب میں ان کو ہمیشہ کے لیے چپ ہونا پڑا۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے۔ اس لیے ان سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔ اور بلا اندیشہ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کی عقلوں میں آئے یا نہ آئے اور ان کے منطقی دلائل اس کو ثابت کرسکیں یا نہ کرسکیں ان کا دل ان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ کسی نہ کسی ہستی کو اپنا خدا تسلیم کریں۔ اور تکلیف ومصیبت کے وقت میں اسی سے مدد کے طالب ہوں۔ فقیر نے ایک سفر میں دو نوجوانوں کو جو غالباً کسی کالج کے طالب علم تھے ریل میں خدا کی ہستی پر بحث کرتے ہوئے دیکھا۔ ایک کا خیال یہ تھا کہ خدا ہے اور اس کے بغیر اس ساری کائنات کی پیدائش اور اس کا نظام محال بلکہ ناممکن ہے۔ اور دوسرا کہہ رہا تھا کہ خدا کوئی نہیں یہ سب کچھ خود مادہ کی تخلیق ہے۔ آخر وہ سٹیشن آگیا جہاں اس منکرِ خدا کا سفر ختم ہوتا تھا اور وہ اُترنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اُترتے ہوئے اُس نے غیر شعوری طور پر فقیر کو بھی ان الفاظ میں مخاطب کیا کہ کیوں مولوی صاحب واقعی خدا ہے؟ میں نے کہا۔ بھائی اگر خدا کوئی نہیں تو تم انکار کس کا کر رہے ہو۔ جو چیز درحقیقت ہے ہی نہیں اس کا انکار کس عقل کی پیداوار ہے۔ وہ بھوچکا سا ہو کر ریل کے دروازے میں کھڑا ہوگیا اور سامان پکڑ کر اترتے میں جلد بازی سے کام لینے لگا سوءِ اتفاق کہیے یا مرضیٔ الٰہی اُترتے وقت پاؤں رپٹ گیا اور پائدان اور پلیٹ فارم کے درمیان گر گیا۔ جس سے اس کو سخت چوٹیں آئیں اور اس کے منہ سے نکلا "ہائے اللہ" سننے والوں نے اس کی آواز پر فوراً پکارا :-

کانٹا ہر اک دل میں ہے اٹکا تیرا
آویزہ ہر گوش سے ہے لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھے جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

خداوندِ عالم جلشانہٗ کی ہستی کو تسلیم کرنے کے بعد اُس کی محبت و تعظیم اور اس کی ذات کا خوف و رعب بھی ہماری فطرت میں داخل ہے۔ اور دنیا کی کسی طاقت سے نہ ڈرنے والے اور ہر صاحب زور سے بہ خوشی مقابلہ کرنے والے بھی اس دیدہ یا نادیدہ ہستی کے خوف سے کانپ جاتے ہیں جسکو وہ قادرِ مطلق اور خالقِ کل تصوّر کرتے ہیں اور اپنے خدا کی محبّت ان کو ایسے سارے کام کرنے پر مائل کردیتی ہے جو معبودِ حقیقی کو پسند ہیں اور اس کا خوف انہیں تمام ایسے اعمال و افعال سے باز رکھتا ہے جن کے متعلق انہیں خیال ہو کہ یہ خداوندِ عالم کی مرضی کے خلاف ہیں۔ کسی نہ کسی خدا کے وجود کا تسلیم کرنا ایک حقیقت اور اس کی محبّت و عظمت اور اس کا خوف دل میں ہونا انسانی فطرت ہے اور ان جذبات کا لازمی نتیجہ یہ ہے، کہ انسان اس وجود کی پرستش پر آمادہ ہوجاتا ہے جسکی عظمت اور جسکا خوف اس کے دل میں بھرا ہو۔ سورج کی پُوجا، دریاؤں اور درختوں کو سجدے، پہاڑوں کے سامنے ناصیہ فرسائی اسی سبب سے ہوتی ہے اپنے معبود کی بندگی خواہ انسانی ذہن میں کوئی معبود ہو انسان اس لیے نہیں کرتا کہ معبود کو انسانی خدمات کی ضرورت ہے یا وہ انسانی بندگی سے اور بلند و بالا ہوجائے گا یا اس کے مدارج بڑھ جائیں گے بلکہ صرف اس لیے کہ انسانی ضمیر اندر سے مجبور کرتی ہے۔ کہ جس ہستی کی محبت، عظمت اور خوف کو انسان نے اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔ اس کی بارگاہ میں زیادہ سے زیادہ رسوخ اور اس کی بزم میں زیادہ سے زیادہ بار حاصل کرے اور اگر ہوسکے تو اپنا تن، من، دھن اس باعظمت ہستی کو خوش کرنے کے لیے قربان کردے۔



حقیقتِ عبادت

بالکل ابتدائی زمانہ کے حالات کا تو علم نہیں اور یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ حضرت آدم علیہ السلام کس طریق پر عبادتِ الٰہی کرتے تھے۔ لیکن بعد کے زمانہ کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں اور بعد کے عبادت کے طریقے بتلاتے ہیں کہ شروع زمانہ میں اکثر تکلیف دہ ریاضتیں عبادت میں شامل تھیں۔ اور شاید سرکش اور نا تہذیب یافتہ انسانوں کی اصلاح کے لیے اور ان کے جذبات پر انہیں غلبہ دلانے کے لیے ایسی ہی سخت اور جانکاہ ریاضتوں کی ضرورت ہو گی کہ انسان اپنے ایک بازو کو یا ایک ٹانگ کو ہر وقت ایسا اونچا رکھے کہ وہ بے حرکت ہو کر بالکل شل ہو جائے یا اس میں لوہے کے کڑے ڈال کر ہمیشہ کے لیے خشک کر دیا جائے۔ یا یہ کہ لوہے کی کیلوں پر بیٹھا جائے جو ہر وقت جسم میں چبھتی رہیں یا اپنے گرد و پیش کانٹے بکھیر لیے جائیں جن سے وجود کا آرام حرام ہو جائے یا مسلسل غیر معین ایام کا روزہ رکھا جائے۔ یا مدت العمر شادی نہ کرے یا کئی کئی مہینے یا سال ایک وضع پر کھڑے تسبیح پڑھی جائے یا درختوں کے ساتھ رسے ڈال کر اور بیر اگنیں لٹکا کر سالہا سال کھڑے کھڑے ہی عبادت میں گزار دیے جائیں۔ پُرانے پُرانے مذاہب کے پیروؤں کو ہم آج بھی اس قسم کی تکلیف دہ عبادت کرتے دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ اور لوگ ان کی اس جسمانی ریاضت سے مرعوب ہو کر ان کے متعلق یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ وہ بہت ہی خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ حالانکہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ کیونکہ عبادت کا یہ طریقِ کار اگر اس لیے اختیار کیا گیا ہو کہ عوام میں مقبولیت ہو تو یہ بڑا غلط سودا ہے۔ اتنی اذیت رساں عبادت سے محض شہرت طلبی ایک نہایت ثمن قلیل کا حاصل کرنا ہے اور اگر اس سے مراد عرفانِ الٰہی ہے تو پھر خلق خدا میں بیٹھ کر اس عقوبت کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اہلِ دنیا سے الگ ہو کر اسی سے لو لگائی جائے اور اسی کی تلاش میں اپنا قصہ پاک کر دیا جائے۔ ایسی عبادت اور اس میں عوام سے خراجِ تحسین حاصل کرنا

بسا اوقات شرک کی سرحد پر پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ اس قدر ریاضاتِ شاقہ ہر انسان نہیں برداشت کر سکتا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم یا ملک میں سے چند افراد اس عبادت کے اہل نکلتے ہیں جو مافوق العادت ہوتی ہے اس لیے قوم کے باقی افراد خود انہی لوگوں کو مافوق الانسان ہستیاں تصوّر کر کے خدا کی بجائے ان کی اطاعت و پرستش اور سیوا شروع کر دیتے ہیں اور ادھر یہ تارک الدنیا بجائے خود اپنے پرستاروں کی تعظیم و تکریم سے متاثر ہو کر حقیقتاً یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ کہ وہ واقعی عام انسانوں سے کوئی بالاتر شے ہو گئے ہیں۔ اور اس طرح وہ کام جو اظہارِ عبودیت کے لیے اختیار کر چکے تھے اس نتیجہ پر پہنچکر ختم ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کو بھول جاتے ہیں اور اس کی عبادت سے باز رہ کر اپنے پرستاروں کو بھی گمراہی میں ڈال کر اصل معبود کی پرستش سے باز رکھ دیتے ہیں اور یہی عمل شرک کا بنیادی پتھر ہے۔ ایسے بیشمار لوگوں کے دنیا کی ترک کے کارنامے ان کی سیاہ کاریوں پر شہادت دیتے ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ بعض زمانہ ساز لوگوں نے اپنی قوم میں غیر معمولی شہرت حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی زندگیاں اختیار کر لی تھیں جو بظاہر تارک الدنیا کا بورڈ لگا کر دنیا داروں سے زیادہ گل کھلانے والی ثابت ہوئیں اور وہی افراد عوام میں دیوتائی کا منصب پا کر شرک کا جزو معین ہو گئے

شرک یا بُت پرستی ایسا عام اور مشہور لفظ ہے جس کی تعریف کی چنداں ضرورت نہیں۔ اگر ہے تو اس کی حقیقت بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم سرسری الفاظ میں اس کے ذکر سے اس کی حقیقت ضرور آشکار ہو جاتی ہے۔ لفظ بُت کسی چیز کے مجسمہ یا نقشہ کا نام ہے جو کسی وجہ سے انسان کے خیال اور توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا بے جا نہ ہو گا کہ بُت پرستی کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی، تاکہ بحث سابق کی تائید ہو جائے۔

دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھیئے پتہ چل جائے گا کہ سب سے پہلے بُت پرستی کا آغاز مشاہیر انسانوں کی خلافِ معمول قوت اور ستارہ پرستی سے ہُوا۔ اقوام میں جو لوگ زیادہ صاحبِ ہمت و زور نکلے اور قوم کو اپنی قوت کا لوہا منوالیا وہی قوم میں پرستاری کے مستحق سمجھے جانے لگے اور انہی کے مجسمے خدائی قوتوں کے حامل قرار دیے گئے۔ حالانکہ خدائی صفات سے ان کی فانی قوتوں کو کوئی دور کی مناسبت بھی نہ ہوتی۔ فرعون، شداد، نمرود وغیرہ اسی نوع کے افراد تھے جو ہمیشہ حق پرستوں کے مقابلہ میں ذلیل

ہو کر برباد ہوئے، دوسرا سلسلہ رہا ستارہ پرستی کا۔ سو مصر کا کلدانیہ، ایران اور ہندوستان میں ستارہ پرستی کا سب سے مقدم ہونا پایا جاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری تاثیرات گرمی، سردی، زراعت کاشت کا نشو و ارتقاء معدنیات کی رنگ آمیزی، نباتات کی نیرنگی اور حیوانات کی تلون مزاجی کو دیکھ کر نظام علوی و سفلی کا باہم ارتباط اور تاثیر و تاثر انسانی عقل میں آیا اور انہی دونوں نظاموں کے طبعی تاثرات دیکھنے کے بعد انکے باہمی تعلقات سمجھ میں آئے۔ جنکی وجہ سے گردش کواکب کے ماتحت ایک طرف علم نجوم قائم ہوا اور دوسری جانب ستاروں کی تاثیر روکنے یا اس کے دفعیہ کے لیے ان کی پرستش شروع کر دی گئی اور اس پرستش کا معکوس نام تسخیر رکھا گیا۔ تاریخ امارسس کا مصنف لکھتا ہے کہ علم نجوم اور اس کے عقیدے کی ایجاد بابل سے ہوئی اور ستارہ پرستی میں یہ تخیل بھی قائم کر لیا گیا کہ ستارے جاندار اور ذی عقل اجسام ہیں اور بعض کے دماغ اس طرف بھی گئے کہ ان میں دیوتاؤں کے مسکن ہیں اور یہ خیال اکثر مشرقی اقوام کے دماغوں پر مسلط رہا ہے گردش کواکب اور اس کی تاثیرات سے یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ ستاروں کا اثر دنیا پر ہے جس سے عوام میں ان کی تعظیم و عبادت کا بھی رواج پڑ گیا اور وہ رفتہ رفتہ قدیم زمانہ میں شخصی اسماء سے موسوم ہو گئے۔

چونکہ یہ ستارے غائب اور غروب ہو جانیوالی ہستیاں تھیں اس لیے ان کی جگہ ان کی ہیکلیں قائم کی گئیں اور ان ہیکلوں کی بھی ویسی ہی پرستش و عبادت ہونے لگی جیسی اصلی ستاروں کی ہوتی تھی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ صابی مذہب کی پرستش اصنام کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔ اور تمام قدیمی اقوام اسی بے معنی تخیل میں جکڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ یہ بھی مانتی تھیں کہ آسمان و زمین کا تمام خلا روحوں سے بھرا ہوا ہے۔ کلدانیہ سے صابی مذہب انہی اعتقادات پر جاری ہو کر مصر اور ہندوستان میں پہنچا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں کے معبد اور مندر صابیوں کے معبدوں کی طرح تھے۔ ان پرانے اعتقادات سے پتہ چلتا ہے کہ ستارے ذی روح اور ذوی العقول ہیں اور ان میں نیک و بد کی تاثیرات موجود ہیں۔ اور گردش زمانہ کا انہی تاثیرات پر انحصار ہے۔ اور ستاروں کا سعد و نحس ہی انسانی اجسام اور دنیا کے تمام امور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بلکہ بارش کا نزول اور بادلوں کی کشش بھی انہی ستاروں کی تاثیر پر منحصر ہے غرضیکہ تمام روئے زمین میں اور خلا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف ستاروں کی تاثیرات سے ہی ہوتا ہے زردشتی مذہب والے بھی اسی عقیدہ کے ماتحت ستاروں کی تعظیم کا بڑی شدت سے حکم دیتے ہیں اور عبادت کے اوقات میں انکی ہیکلوں کو پیش نظر رکھنے کی

خصوصی ہدایت کرتے ہیں۔

ایسے ہی ہندو مذہب کی حالت بھی محض قدرتی مظاہر کی پرستش بتائی جاتی ہے جس میں نظام علوی کواکب پرستی اور نظام سفلی، نباتات، حیوانات اور جمادات داخل ہیں۔ اور اسی بنا پر رگ وید میں جن قابلِ پرستش دیوتاؤں کا تذکرہ ہے۔ وہ اس ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں:-

(۱) اندر (بارش کا دیوتا) (۲) ورنا۔ انصاف کا دیوتا (۳) وشن وشنو۔ سورج یا روشنی کا دیوتا۔ (۴) (وایو) ہوا کا دیوتا (۵) (یاما) صبح وشام کا دیوتا (۶) (سرسوتی) علم یا دریا کا دیوتا۔ غرضیکہ یہی وہ دیوتے ہیں جو معبود یا قابلِ پرستش سمجھے جاتے ہیں اور انہی کی اب بھی پرستش کی جاتی ہے۔ خود کرشن جی کا قول ہے کہ عوام جب نامعلوم خدا کا تصور نہیں کر سکتے اور نہ اسکی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں تو پھر وہ موجودہ کائنات ہی کو خدا کیوں نہیں سمجھتے اور اسی تحقیق پر کرشن جی نے سب سے پہلے اپنے آپ کو خدا کہا۔ یہ مقام ہماری اس کتاب میں تفصیل بیان کی ضرورت سے الگ ہے۔ اس لیے ہم اس بحث کو چھوڑ کر اصل موضوع کی وضاحت کرتے ہیں۔

ہزاروں برس کے تاریخی معلومات کا مطالعہ اور انسانی نفسیات کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ خداوندِ عالم کی عبادت کا کوئی ایسا طریقہ مقبولِ عام نہیں ہو سکتا جس میں بہت کچھ دقت اور محنت کرنی پڑتی ہو اور جو طریقہ عوام میں اس لیے پسندیدہ نہ ہو کہ اس میں وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہو۔ کیونکہ دنیوی زندگی کی کشمکش اور روزی کمانے کی جدوجہد تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے اور متمدن ومہذب ممالک کی آبادی کے پاس فرصت کا بہت کم وقت ہوتا ہے جس میں وہ یادِ خدا کے لیے پورا پورا رجوع کر سکیں۔

اس تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ صابی مذہب میں ستارہ پرستی یعنی نظام علوی کی عبادت تھی تو زرتشتی دین میں کواکب پرستی کے ساتھ ساتھ آتش پرستی بھی عبادت کا جزوِ لاینفک بنی ہوئی تھی۔ ہندو دھرم میں مخلوق پرستی دیوتا پرستی، ہیرو پرستی اور بت پرستی رواج پذیر تھی تو اس سے بڑھ کر بدھ مت میں اصنام پرستی اور انسان پرستی زوروں پر رہی۔ اب ان مذاہب پر اجمالی نظر ڈالیے جو خدا پرستی کے دعویدار خیال کیے جاتے ہیں کہ ان میں کہاں تک پرستش کردگار پائی جاتی ہے۔ یہود، عیسائی اور مسلمان یہ تین گروہ ہیں جو خدا پرست خیال کیے

جاتے ہیں۔ ہم ان تینوں مذاہب کے بانیوں کے متعلق کچھ بھی لب کشائی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کے فرستادہ صادق رسول اور گناہوں سے معصوم تھے۔ زیر بحث مسئلہ صرف اُن کے بگڑے ہوئے طریق مذہب کا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ خدا پرستی ان تینوں میں سے بحالہٖ کس میں باقی ہے اور کس کا طریق عبادت بُت پرستی اور شرک کی آلائشوں سے پاک ہے۔

خدا پرستی کے پانچ رکن ہیں۔ توحید[1]، رسالت[2]، اوامر[3]، نواہی[4]، سزا و جزا[5]۔

توحید۔ تمام مبداء و معاد کا مرکز ہے اور مبداء و معاد مخلوق کے آغاز و انجام کا نام ہے۔

رسالت۔ ایک قدرتی مشعلِ نور ہے جو مبداء و معاد کی تاریکیوں کو دور کرتی ہے اور اس کا نورانی جلوہ دکھاتی ہے۔ یہی نور و ظلمت اوامر و نواہی ہیں جن سے مبداء و معاد کا سلسلہ قائم ہے اور انہی کی بنا پر سزا و جزا منتج ہوتی ہیں۔

مذہب یہود۔ اپنے اندر پانچوں ارکان موجود ہونے کا مدعی ہے اور اس کے ماننے والوں کا دعویٰ ہے کہ ہم خالص توحید پرست ہیں۔ ہمارے برگزیدہ رسول حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ۱۵۰۰ء قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور اوامر و نواہی اور سزا و جزا کے احکام تعلیم فرمائے۔ خدا کی توحید پھیلائی اور اپنی قوم کے سامنے کتابِ الٰہی تورات کو پیش کیا اور خود پردہ پوش ہو گئے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ توحید بھی پھیلائی۔ بُت پرستی کے خلاف جہاد بھی ہوا۔ نماز کو ذریعۂ عبادت بھی قرار دیا۔ صحیح اعمال و عقائد کی تعلیم بھی دی لیکن یہ تو بتائیے کہ ۳۹۵ء قبل مسیح کے پیدا شدہ نبی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا کس توحید پرستی سے لیا گیا ہے۔ اور اس شرک آمیز توحید کا کیا ثبوت ہے۔ کیا نعوذ باللہ وہ واقعی خدا کے بیٹے تھے اور کیا حسب تعلیم موسیٰ علیہ السلام خداوند عالم وحدہٗ لاشریک تمام نقائص اور صفات نقصان سے بری نہیں ہے۔ کیا نسبتِ فرزندی کسی طرف سے اس کی ذات کے لیے جائز ہے۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ توحید میں تثنیہ کیسا۔ پھر یہ بتائیے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نماز مواحدانہ نہ تھی۔ کیا تعلیم کے مطابق خدا کے سامنے جبّہ سائی گناہ ہے اگر نہیں تو انکی امت نماز میں سجدہ کرنے کو کیوں عار سمجھتی ہے۔ کیا خدا کے سامنے سجدے کا انکار کفر نہیں اور کیا ان

اعمال وعقائد سے قوم یہود حق پرست اور موحد ثابت ہوسکتی ہے؟

مذہب عیسائی - یہودیوں کی طرح عیسائی بھی مدعی ہیں کہ نظامِ خدا پرستی کے ارکانِ خمسہ ہم میں موجود ہیں اور اگر پوچھا جائے کہ تمہاری مذہبی کتاب جو مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی کہاں ہے۔ اور کیا بقول فارلانگ یہ موجودہ انجیل ۱۷۵ء میں نہیں بنی ہوئی ہے اور اگر یہ وہی منزل من اللہ انجیل ہے تو ایک کی بجائے یہ چار کیوں ہیں! اور ان میں اختلاف کیوں ہے۔ کیا یہ متی، یوحنا، مرقس وغیرہم کے اقوال کا مجموعہ نہیں؟ جسکو آج انجیل کے مقدس نام سے تعبیر کیا جارہا ہے اور خود ترمیم کرکے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ توحید الٰہی کے بھی حصے بخرے کردیے اور ایک خدائے واحد جلّ شانہٗ کو تین حصوں میں منقسم کردیا باپ، بیٹا، روح القدس کی پیدائش کیونکر ہوئی اور کہاں سے؟ اور خالق و مخلوق کے تعلقات ایک دوسرے میں کیونکر غائب کردیے گئے۔ کیا رب العزت مادہ اور مادیات سے پاک نہیں؟ کیا یہ من گھڑت تخیل اور خود ساختہ نظریہ ہے یا مسیح کی تعلیم روحانی۔ اگر تفکر و تدبر کے ماتحت ٹھنڈے دل اور انصاف وعقل سے فیصلہ کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ یہ نظامِ خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔ قدرتی روشنی پر نفس پرستی کے پردے ڈال دیے۔ اور توحید کو تثلیث سے بدل دیا گیا۔ عبادت میں نہ خلوص نہ صداقت نہ رکوع نہ سجود، نہ روح میں روشنی نہ حواس میں یکسوئی۔ جو دل میں آیا کیا۔ اور جو نفس نے قبول کیا وہ لیا۔ یہ بت پرستی، انسان پرستی یا نفس پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

مسلمان - خالص توحید کے رنگ میں خدائے واحد کی پرستش کرنا اور اسکی عبادت میں محو ہونا مسلمان ہی کا کام ہے۔ دست بستہ اس کے حضور میں کھڑا بھی ہوتا ہے خشوع وخضوع سے جھکتا بھی ہے۔ زمین بوس ہوکر جبہ سائی بھی کرتا ہے اور ادب و تہذیب سے مولا کریم کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے مگر تعداد سے خارج، قادر ہے مگر روح وجان کی مدد سے نہیں، بولتا ہے بغیر زبان کے اور سنتا ہے بغیر کانوں کے اور دیکھتا ہے بغیر آنکھوں کے۔ عالم ہے بعلم حضوری جس کو استدلال کی ضرورت نہیں۔ رازق ہے بغیر احتیاج کے اور اپنے افعال وایجاد میں مختار ہے مجبور نہیں۔ اپنے ہر کام میں حکیم ہے اور علم میں محیط الکل۔ ازلی ہے اس کی ابتدا نہیں

اور ابدی ہے اسکی انتہا نہیں۔ تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے۔ عیب سے پاک ہے۔ نقصان سے منزّہ ہے۔ اور انسانی ادراک سے اس کی حقیقت خارج ہے۔

عبادت کے معنی خدائے قدوس کی بارگاہ میں سر جھکانے، اپنی عبودیت کا اظہار کرنے اور اللہ تعالیٰ جلّ وعلا شانہ، کو وحدہٗ لاشریک لہٗ سمجھنے کے ہیں اور عبادت اس وقت تک عبادت کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ جبتک بندہ سراپا نیاز ہوکر اپنے پورے عجز اور معبود کے پُورے جبروت وجلال کے تصوّر کے ساتھ سرِ عبودیت نہ جھکائے۔ اس کی غرض قربِ خدا اور وصلِ الٰہی ہے اور بہترین طریقِ عبادت وہی ہے جس سے وصلِ الٰہی میسّر آئے۔ عبادت قریباً ہر مذہب ومشرب میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اور مختلف طریقوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ مگر بعض لوگوں نے اپنے انسانی ذوق سے کام لے کر اس میں ایسی چیزیں ایجاد بھی کر لی ہیں۔ جن سے ان کی عبادت ایک مضحکہ بن کر رہ گئی ہے۔

اکثر نے یہ سمجھ لیا کہ بارگاہِ خدا تک پہنچنے میں دنیا اور اس کے تعلّقات بہت حارج ہیں۔ اس لیے وہ دُنیا سے علیحدہ ہی ہو گئے۔ عیسائی، یہود، ہنود اور بدھ سب اسی میں اُلجھ کر جنگلوں اور ویرانوں میں منہ کر گئے پہاڑوں کے غاروں میں جا گھسے۔ تنہا گوشے تلاش کیے اور سنسان بیابانوں میں فروکش ہو کر ایک کو ڈھونڈنے اور ایک ہوکر ایک ہی کے ہو رہنے کی سعی میں عمریں گزار دیں لیکن ان جانکاہ ریاضتوں کا نتیجہ صفر ہی رہا۔ اور اگر اس ترکِ دنیا سے کسی نے گوہرِ مراد بھر بھی لیا۔ اور اس سے کسی دوسرے انسان کو نفع نہ پہنچا تو یہ کوئی کمال نہیں وہ صرف اپنی ہی قبر پاک کر لینے تک محدود رہا۔ کمال یہ ہے کہ قعرِ دریا میں تختہ بند ہوکر دامن کو خشک لے آئے۔ حوادثات وآفات کے ہجوم میں محصور ہوکر ثابت قدم رہے۔ آتشکدۂ ہموم میں گرے اور اپنی ذات پر کوئی آنچ نہ آنے دے۔ دنیا میں رہے اور دل کو صاف رکھ کر پاکباز رہے سراسیمگیوں اور اضطراب اندوزیوں کے گرداب میں ہچکولے کھائے۔ اور دامنِ ہمّت ہاتھ سے نہ چھوڑے کیونکہ ساحل پر کھڑے ہوکر حوصلہ کا مدعی ہونا۔ معرکۂ کارزار سے دور رہ کر اپنی جرأت پر ناز کرنا اور باغ میں متمکن ہوکر اپنی بلا اندوزیوں کی قوتِ برداشت کا ذکر کرنا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ عبادت بہرکیف عبادت ہے۔ مگر ایک یکسُو، فارغ البال اور عزلت گزیں انسان کی عبادت اور ایک مصروفِ کار دنیادار انسان کی

عبادت میں فرق ہے۔ حضور علیہ السّلام نے خود اس کی تشریح فرمادی ہے۔ کہ دنیا دار کی دو رکعت صحیح نماز غیر دنیادار کی ستر رکعت کے برابر ہیں۔ کیونکہ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ کہ دنیا خدا کی راہ سے روکتی ہے۔ رُکنے والے پست ہمت ہر حالت میں رُک جاتے ہیں اور نہ رُکنے والے کہیں بھی نہیں رُکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا خدا کی راہ میں حائل نہیں ہوتی بلکہ اس کا بے محل استعمال جادۂ استقامت سے ہٹا دیتا ہے۔ دلدادگانِ رہبانیت نے نظر کو وسعت نہ دی اور یہ سمجھ بیٹھے کہ فی الواقع یہ دنیا ہی وہ چیز ہے جو بندے کے مولا تک پہنچنے میں حارج اور حائل ہے اسی لیے اسلام نے رہبانیت کو ناجائز قرار دے دیا کہ اگر یہ وسیع و عریض ہمہ گیر اور اتنی اہمیت کی کائنات انسان کے لیے قابلِ ترک چیز تھی تو آخر اس کی پیدائش کا مطلب کیا تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو انسان دنیا سے کُلی طور پہ انقطاع کرے وہ خدائے قدوس کی اتنی بڑی ساخت کو لغو اور عبث قرار دیتا ہے اور یہ طریقِ کار قطعی بے حقیقت ہے۔ بہترین طریقِ عبادت وہی ہوسکتا ہے۔ جو انسان کے لیے موجب مشقت نہ ہو۔ لہٰذا اسلام نے جو طریقِ عبادت مقرر فرمایا ہے۔ وہی آسان اور قابلِ عمل بھی ہے۔



اِستعانت

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ

یہ کلمہ اسلام کا عنوان ہے۔جس کا مفہوم ہے اللہ کے سوا کوئی ذات قابلِ عبادت و مستحقِ استعانت نہیں۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں جو اُس کے پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔اس کے دو حصے ہیں ایک لا الٰہ الا اللہ۔ دوسرا محمد رسول اللہ۔پہلا حصہ اسلامی تعلیم کا خلاصہ اور دوسرا اسکی سند ہے۔یعنی یہ تعلیم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دی جو اللہ کے فرستادہ ہیں۔اس کلمہ طیبہ کا ماحصل یہی ہے کہ ذل و افتقار کی نسبت جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذاتِ الٰہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی ہے۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہیں اور اسی فقر و احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر عارضی نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا معبود قرار دے دیتا ہے۔خواہ وہ چیز نباتات، جمادات، حیوانات یا عناصر سے ہو۔اور یہی اس کی نادانی و جہالت بعض اوقات اپنے سے کمتر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور بھی کر دیتی ہے۔حواس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے دینِ حق کا یہ پیغام سرکارِ دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا۔اور اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے، تو اسی ایک لازوال ہستی کے آگے جس کے دستِ قدرت میں ساری کائنات کی باگ ڈور ہے اور جو جملہ صفاتِ کمالیہ سے متصف اور تمام عیوب و ذنوب سے مبرا و منزہ ہے۔وہی ہمارا اللہ، وہی معبود وہی مستحقِ استعانت، وہی خالق، وہی مالک، وہی رب اور وہی حاکم ہے۔ہم اسی کی مخلوق اسی کے

مملوک اسی کے عبد اور اسی کے محکوم ہیں۔ اسی سے تمام حاجات و مرادات کی طلب کرتے ہیں اور اسی کے در کے فقیر ہیں۔ فریب خوردہ انسان اگر غور کرے تو اس کو پتہ چل جائے گا کہ کلمۂ طیبہ کے مفہوم نے اس کو کیا سے کیا کر دیا ہے یا تو وہ ایک ذلیل و خوار جانور کی طرح ہر ایک سے خوفزدہ تھا یا رسالت کے تعلق اور نبوت کے علم سے غیراللہ کی عبادت و عبودیت کا جُوا گردن سے پھینک کر اپنے حقیقی مولا سے لَو لگا لیتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے۔

کیونکہ عبادت انتہائی تذلّل و انکساری کا نام ہے جس کا اظہار معبودِ حقیقی کے سوا دوسرے کے آگے ہو نہیں سکتا۔ اسلامی عبادت کے معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ جو ہیں ان میں صرف نماز پر ہی اگر غور کیا جائے تو عبادت یا اظہارِ تذلّل کا مفہوم بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً نمازی نماز کا ارادہ کرنے لگا ہے تو خیال میں جائے نماز اور زبان پر اپنے رب کے حضور میں حاضری کے الفاظ ہیں کہ اپنے معبود کی جانب جا رہا ہوں۔ وہی مجھے ہدایت فرمائے گا۔ دل غیرِ حق سے پاک ہے اور اس کے سوا کسی کو بندگی کا مستحق نہیں سمجھتا اور اسی فہم کے تحت تکبیر تحریمہ کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک لے جاتا ہے۔ کہ تیری ذات کے سوا دونوں جہان کے تعلقات سے الگ ہوتا ہوں۔ دل پوری طرح متوجہ بحق ہے۔ اور نیت میں پورا خلوص رکھ کر معبود کے آگے کھڑا ہے۔ عاشقانہ ایمان سے پڑھ رہا ہے۔ تیری ذات پاک ہے تو ہی حمد کا مالک ہے۔ تیرے ہی نام میں برکات ہیں۔ تیری ہی ہستی بلند و برتر ہے اور تیرے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں۔ گویا ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور توحید و جبروت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کیے ذلّت و مسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے۔ محامد و محاسن کی سزاوار اسی کی ذات کو سمجھتا ہے۔ ربوبیت اسی کو زیب دیتی ہے۔ عالم تمام اسی کا مربوب ہے۔ مالک یوم الدین کہہ کر عالم خوف و ہراس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد اقرار عبادت اور اسی سے استعانت کرتا ہے۔ پھر آخری الفاظ میں دعا مانگ کر یوں عرضگذار ہوتا ہے۔ کہ اہل انعام کی راہ نصیب فرما جو انبیاء و اولیاء کی راہ ہے۔

الغرض مذہب مشتمل ہے دو اجزاء پر عبادت اور استعانت پر یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے دلوں سے غیراللہ کا تخیّل ربوبیت و معبودیت کا فنا ہو جانا جس سے ہم اغیار کی پرستش سے ہٹ کر ایک ہی ذات واحد کے لیے ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلنے لگتے ہیں۔ اور

یہ سب اسی کی توفیق سے ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم اس مسئلہ میں وہ تحقیقی مطالب بیان فرماتا ہے۔جن سے شکوک واوہام کی تمام غیر ایمانی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔اور کسی غیر کی پرستش پر متوجہ ہونے کی قطعاً گنجائش ہی نہیں رہتی۔

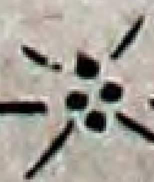
۱۔ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے جو حیّ وقیوّم ہے اس کے سوا اور کوئی زندہ اور قائم نہیں۔اور تمام خلق اسی کے سہارے زندہ ہے اور وہی سب کا معین ہے۔

۲۔ خداوندِ عالم نیند اور اونگھ سے پاک ہے کیونکہ اُونگھ اور نیند غفلت کی جڑ ہے اور خدا تعالےٰ غفلت سے منزّہ ہے۔تمام مخلوق نیند پر مجبور ہے۔اس لیے ہر ذی روح کی حفاظت اسی پر ہے جس کو نیند اور اُونگھ نہیں۔

۳۔ ارضی وسماوی تمام اشیاء کا وہی مالک ہے جس کی یہ مِلک بلا شرکت غیرے ہے۔اس خلقت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں۔

۴۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی اس کے حضور میں شفاعت نہیں کر سکتا۔مگر جس کو وہ اذن دے منکرینِ شفاعت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ جلّ وعلا شانہٗ کی جانب سے کچھ مقبول ہستیاں شفاعت کے لیے ماذون ہیں اور یہ بڑا فضلِ ایزدی ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کو زمین وآسمانوں کی حفاظت نہیں تھکاتی۔بلکہ مخلوق کی تمام تر کمزوریاں اپنی تھکاوٹ کے اظہار میں لابدی ہیں۔اور ذات ربّ العزّت بہت بلند وبالا ہے۔آسمانوں اور زمین سے رزق دینا، مُردہ سے زندہ کو نکالنا اور زندہ کو مُردہ کر دکھانا اور تمام امورات میں تدبیر۔اس کے ہی قبضۂ قدرت میں داخل ہے۔اسی نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند کیا اور وہی خود عرشِ معلیٰ پر جلوہ فرما ہُوا شمس وقمر اور تمام اجرامِ فلکی اسی کے حکم کے تابع ہیں اور سب پر اسی کی تسخیر کام کرتی ہے اور وہی استعانت کا مالک ہے۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ۔



عبد و معبود کے تعلّقات

اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ بندے اور خدا کے درمیان براہِ راست ایسا تعلّق پیدا کر دے۔ کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسری ہستی حائل نہ ہو۔ بانئے اسلام محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیّل اور اس زرّیں نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے اور معبودُ کا منشاء کیا ہے۔

مذہبِ اسلام ظاہری و باطنی، صوری و معنوی خوبیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کی مثال لانے سے دُنیا بھر کی تاریخ عاجز ہے۔ یہ تمدّن، یہ تہذیب، یہ طریقِ معاشرت، یہ اصولِ معیشت، یہ حسنِ سیرت، یہ پاکیزگیٔ اخلاق یہ یگانگت، یہ محبّت، یہ اتحاد کسی مذہب میں بھی نہیں ملتا۔ اعمال کو برطرف رکھ کر صرف عقائد ہی کی اصلاح پر غور کیجئے۔ انبیاء و مرسلینؑ کا تعارف، ملائکہ کی تعریف، حشر و نشر کی تفصیل، جزائے اعمال کی توضیح۔ خداوندِ قدوس کا تصوّر، خدا اور خدائی کے رابطہ و علاقہ کی تشریح، عبد و معبوُد کے درمیانی رشتہ کی وضاحت جیسی کچھ اسلام نے کی ہے کہیں اور نہیں پائی جا سکتی۔ درآنحالیکہ اسی رشتہ کی تصدیق و توثیقِ ایمان کی علامت اور اسی کا قطع و نسخ کفر کا پیش خیمہ ہے۔

یہودیوں کے ہاں بھی صفاتِ خداوندی کے تذکرے موجود ہیں لیکن انسانوں کے لیے ان صفات کا تعلّق بس خدائے خداوند کے غیض و غضب، اس کی شانِ جباری اور صفتِ قہرمانی کے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور عیسائیوں کے ہاں بھی اوصافِ الٰہی مسطور ہیں۔ لیکن اولادِ آدم کے معاصی پر باپ کو ندامت اور پشیمانی کے سوا کسی دوسرے تعلّق کا پتہ نہیں چلتا۔

مگر شارعِ اسلام سرکارِ دوجہان محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے لائے ہوئے مذہب میں

خداوندِ عالم کی صفات اور اُس کے بندوں کے تعلقات کا ایسی شرح و بسط سے پتہ چلتا ہے کہ اُسے سمجھ کر بندۂ خدا کی بندگی کا صحیح لطف اٹھا سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم کر سکتا ہے کہ حقیقتاً خدائے خلاق کی پرستش کا حق کیا ہے۔ اور خدا کا اپنے بندوں کے ساتھ تعلق صرف جبر و قہر اور رحم و کرم تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ ایک ہی وقت میں جبار و قہار بھی اور رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ شدید العقاب بھی اور حنان و منان بھی۔ وہی مارنے والا وہی زندہ کرنے والا۔ وہی خالق و رازق وہی شافیٔ مطلق۔ وہی بیمار کرنے والا، وہی شفا بخشنے والا۔ ذلت و عزت سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ہر غائب اسی کے علم میں حاضر اور ہر پوشیدہ اسی کے علم میں ظاہر ہے۔ دل کی ہر کھٹک کو سنتا اور کھلی چھپی ہر حرکت کی خبر رکھتا ہے۔ کائنات کا ہر تغیر اسی کی مرضی کے موافق اور مادہ کا ہر انقلاب اسی کی مشیّت و حکمت کے مطابق عمل میں آتا ہے۔ دُنیا کا ہر شاہ و گدا، ہر امیر و غریب، ہر عالم و جاہل اسی کا محتاج اور وہ سب سے غنی اور بے نیاز ہے۔

خدا کی صفات اور بندوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا یہ مختصر سا خاکہ ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے جس میں کہیں وہ خلق و ایجاد کی شان میں ظاہر ہوا اور کہیں حاکمِ یوم معاد بن کر سامنے آیا۔ کہیں گنہگاروں کے گناہ بخشنے کے اقرار اور کہیں منکروں کے سر کچلنے کے آثار۔ کہیں زندوں کو مردہ کیا اور کہیں مُردوں کو زندہ کر دکھایا۔ کہیں عبرت و بصیرت کے لیے دلآویز قصے سنائے اور کہیں اپنے انعام و اکرام کے موتی بکھیرے۔ غرضیکہ ہر صورت اور ہر حکمت سے اپنی معبودیت اور بندوں کے ساتھ اپنی متعلقہ ازلیت و ابدیت کا راز آشکار فرمایا۔ گویا بندوں کے لیے کتاب اللہ کا ایک ایک حرف اس کے تعلق اور مستحکم رشتہ کا آئینہ دار ہے۔ سارے عالم کا پروردگار ہے تو وہ۔ بندوں کے ساتھ اگر رحم و کرم کرنے والا ہے تو وہ قیامت کے دن عتاب و ثواب کا مالک ہے تو وہ۔ بندوں کو عبادت کرنی چاہیئے تو اسی کی، اور اگر مدد مانگنی چاہیئے تو اُسی سے۔ ہر حال میں بندہ اس سے اتنا ملحق ہے کہ کسی وقت بھی علیحدگی کا تصوّر نہیں کر سکتا۔ سورۂ بقر میں اس الحاق پر عجیب پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا۔ عجب نہیں کہ تقویٰ و پاکیزگیٔ قلب کی لطافت سے بہرہ اندوز ہو۔ وہ تمہارا پروردگار ہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش اور آسمان کو سقف بنایا

اور آسمان سے پانی برسا کر تمہارے کھانے کے لیے پھل پیدا فرمائے۔ پس کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور تم جانتے ہو۔ پھر دوسرے مقام پر بیان ہوا کہ تم کیسے خدا کے ساتھ کفر کرتے ہو درآنحالیکہ تم بے جان تھے پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندہ کیا پھر وہی تم کو مارتا ہے اور پھر وہی تم کو زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی جانب لوٹ کر جاؤ گے۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی کُل کائنات پیدا فرمائی پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا پس سات آسمان بنائے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ سبحان اللہ۔ کس انداز سے اپنے بندوں کے ساتھ کیا کیا تعلقات ظاہر فرمائے۔ یہ بہتے ہوئے دریا۔ یہ اُبلتے ہوئے چشمے۔ یہ لہلہاتا ہوا سبزہ۔ یہ اونچے اونچے پہاڑ، یہ گھنے اور گنجان جھاڑ۔ یہ تناور درخت۔ یہ خوش رنگ پھول اور پتے، یہ چرند و پرند، یہ تمام نباتات و جمادات۔ انسان کے لیے اسی کی قدرت کے شواہد ہیں جن سے ہر لحظہ انسان مستفید ہو رہا ہے۔ اور ایسی سینکڑوں آیاتِ الٰہی ہیں۔ جن کو پڑھنے، سننے اور دیکھنے کے بعد خدا کے وہ تعلقات جو وہ اپنے بندوں کی مادی دنیا سے رکھتا ہے۔ پوری پوری وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں اور بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ عالم مادہ کے یہ سارے تغیّرات جن سے آئے دن ہم اپنی زندگیوں میں بیش از بیش فوائد حاصل کر رہے ہیں۔ دراصل ہمارے خدا نے ان کی تخلیق ہمارے ہی لیے فرمائی ہے۔ اور نہ صرف یہ مادی کائنات کا تعلق ہی ہے بلکہ اس کو بندوں کی روحانیت سے بھی ایک ازلی علاقہ ہے اور انکی روحانی کائنات کی آسائش و زیبائش کی فکر بھی کی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان فرمایا کہ ان میں ایک رسول ان ہی کی جنس سے مبعوث فرمائے جو ان پر آیاتِ قرآنی کی تلاوت فرماتے اور انکا تزکیۂ نفس کرتے اور انکو قرآن و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اگرچہ اس سے قبل لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔ پھر اسی طرح قرآنِ پاک جگہ جگہ مولا اور بندوں کے روحانی تعلّقات کا اظہار فرماتا ہے۔ بندوں کی مادی زندگی ہو یا روحانی، قرآنی تعلیم کے مطابق ان کا معبود ہر آن انکی نصرت و دستگیری فرماتا ہے اور ہر حالت میں ان کے کام آتا ہے۔ پس جس معبودِ حقیقی کا اپنے بندوں کے ساتھ یہ تعلق ہو۔ انصاف اور انسانیت کا تقاضہ ہے کہ بندے بھی زندگی کے ہر ہر لمحے میں اس کو یاد رکھیں۔ خلوت و جلوت، ظاہر و باطن، امارت و غربت، صحت و علالت کسی حالت میں بھی اس کی عبادت سے غافل نہ ہوں۔ زندگی ہو تو اسی کے لیے اور موت آئے تو اسی کی راہ میں۔ اور یہی اس ارشاد کی تعمیل ہے۔ یہی ہیں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی جاتی ہے کہ اے میرے محبوبؐ فرما دیجیے۔ میری نماز اور میری عبادت، میری زندگی اور میری موت سب کچھ اسی اللہ تعالےٰ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اسی مندرجہ بالا مضمون کا نمونہ تھی۔ ایک طرف تو آپ کے عمل نے مسلمانوں کے لیے یہ اسوۂ حسنہ قائم کر دیا کہ وہ ہر کام خدائے واحد کے لیے کریں۔ اور دوسری طرف اپنی زبان حقیقت ترجمان سے مسلمانوں کے لیے وہ لائحۂ عمل تعلیم فرمایا کہ جس پر عمل کر کے انسان زندگی کے اس مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے جو معرفتِ الٰہی کی آخری منزل کہی جا سکتی ہے۔ جس میں بندہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے کسی آن بھی اپنے مولا و معبود سے غافل نہیں رہ سکتا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سائل کے سوال کے جواب میں یہ فرمانا کہ ہمیشہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیئے اسی اشارہ کو پورا فرماتا ہے حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں۔ حضورِ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہیں چند ایسے کلمات نہ بتا دوں کہ تم سوتے وقت پڑھ لیا کرو۔ اگر اس رات میں تمہاری موت بھی ہو جائے تو تم اسلام پر مرو گے اور اگر صبح زندہ اٹھو گے تو اجرِ عظیم پاؤ گے۔ پھر وہ کلمات ارشاد فرمائے جن کا ترجمہ یہ ہے:۔

اے میرے خدا میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی۔
اور تیری ہی طرف متوجہ ہوا اور اپنا معاملہ تیرے ہاتھ میں
دے دیا۔ تیری بخشش کی امید پر اور تیری ناراضگی کے
خوف سے اور میں نے تجھی پر بھروسہ کیا سوائے تیری
طرف کے اور کہاں جائے پناہ ہے۔ میں تیری اس کتاب
پر جسکو تُو نے نازل فرمایا اور تیرے ان نبی (علیہ السلام)
پر جن کو تو نے بھیجا ایمان لایا۔

عین اسوقت جبکہ دن بھر کی محنت و مشقت سے تھکا ہارا خدا کا بندہ اپنے اعضاء میں از سر نو چستی و چالاکی پیدا کرنے کے لیے کچھ دیر آرام کرنا اور سستانا چاہتا ہے اس کے لیے حضور علیہ السلام و الصلوٰت مندرجہ بالا کلمات تعلیم فرماتے ہیں۔ جن کا بظاہر اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کہ آرام کے وقت بھی معبودِ برحق کی کبریائی اور اپنی

درماندگی اور بیچارگی کا اعلان کر کے رشتۂ عبودیت میں ایک مضبوط کڑی کا ایک اور اضافہ کر دیا جائے۔ رات بھر آرام کی نیند کرنے کے بعد جب یہ خدا کا بندہ بیدار ہوتا ہے تو پھر اسی کے ذکر کی تلقین کی جاتی ہے جس کا نام لیکر وہ چند گھنٹے پہلے سویا تھا۔ اور پھر سونے جاگنے پر ہی موقوف نہیں رکھا بلکہ ہر کام کے آغاز میں معبود کا نام زبان پر اور اس کی قدرت و عظمت کا یقین دل میں ہونا ضروری ہے۔ مثلاً مسلمان اگر سفر کا ارادہ رکھتا ہے تو بھی معبود ہی کا بھروسہ کرتا ہے۔ اور اسی سے اعانت طلب کرتے ہوئے اپنا قدم گھر سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے راہنما (فداہ اُمّی و ابی) صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہی عمل تھا۔ اور اگر سفر سے واپس لوٹتا ہے تو وہ اس وقت بھی معبود ہی کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر سفر و حضر میں وہی اس کا محافظ و ناصر ہوتا ہے۔

الغرض زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں خداوندِ عالم کے مسلمان بندے کو اپنے مولا سے ذرا بھی غافل رہنے کی فرصت دی گئی ہو۔ یا اس کی حیات کا کوئی حصہ پایا جاتا ہو جس میں اُسے خدا فراموشی کا ادنیٰ سے ادنیٰ موقع بھی مل سکے وہ ہر حال میں اپنے معبود ہی کی عظمت و جبروت کا کلمہ پڑھتا نظر آئے گا۔ خلوت کا گوشۂ تنہائی ہو یا جلوت کی رنگینئ بزم کہیں بھی اس کے ہاتھوں سے اپنے معبود کی رضاجوئی کا رشتہ نہیں چھوٹتا۔

ہر مذہب گو اپنی صداقت و حقانیت کا مدعی ہے۔ اور اس کا دعویٰ ہے کہ اسی سے صراطِ مستقیم ملتی ہے اور اسی کی اتباع میں معرفتِ الٰہی کا سراغ لگتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سوا کوئی بھی دوسرا مذہب ایسا نہیں جس نے مالک و مملوک، خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے رشتوں کو اس طرح جوڑا ہو جو اپنی مثال آپ ہیں یعنی خدا سے بندگی اور بندوں کی بیچارگی کے یہ تعلّقات جو اوروں کو پے در پے ریاضتوں اور متواتر مجاہدوں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ ایک لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے والا محض اپنی زبان کو حرکت دے کر حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہی وہ مقدّس مذہب ہے جس نے شریعت کی راہ سے طریقت و حقیقت کی کٹھن منزلیں طے کرادیں۔ اور اپنے متبعین کو معرفتِ الٰہی کے وہ مناظر دکھلائے جن پر فرشتوں کو بھی رشک آئے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔

تصوّرِ الٰہی کا تدریجی ارتقاء

دنیا کی ہر چیز کی طرح انسان کا فکر وعمل اور انسانی فکر وعمل کی ہر بات کی طرح اس کے روحانی تصورات نے بھی بہ تدریج پستی سے بلندی کی طرف اور نقص سے کمال کی طرف ترقی کی ہے۔ روحانی تصورات کی پہلی بنیاد ایک خالق کائنات ہستی کا تصوّر ہے۔ جس وقت سے انسان کی تاریخ روشنی میں آئی ہے اس کے اس تصوّر کی تاریخ بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر پُرانے سے پُرانے عہد کے تصوّر سے لے کر موجودہ ادیانِ عالم کے عہد تک کے تمام تصوّرات سامنے رکھے جائیں اور یکے بعد دیگرے ان کی نوعیت پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آجائیگا کہ ایک تدریجی ارتقاء کا سلسلہ ہے جو اشیاء و اجسام کے ارتقاء کی طرح انسان کے تصوّر واعتقاد میں بھی جاری ہے اور جوں جوں انسان کی فکری اور معنوی استعداد ترقی کرتی جاتی ہے اس کا یہ تصوّر بھی زیادہ بلند اور شائستہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ارتقاء کے ہر سلسلے کی طرح اس سلسلہ کی بھی تکمیل کی آخری کڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں خدا کے تصوّر سے مقصود اس کی صفات کا تصوّر ہے۔ اس کی ہستی کا اعتقاد مراد نہیں ہے۔ اس کی ہستی کا اعتقاد ذہن وفکر کی پیداوار نہ تھی۔ جو اسکی استعدادی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی۔ یہ اس کی فطرت کی آواز تھی۔ جو خود اس کے اندر سے اٹھتی تھی۔ اور ایک بالاتر ہستی کے یقین کے جوش سے اسکو معمور کر دیتی تھی۔ چونکہ یہ ایک فطری جذبہ تھا اور فطری جذبات کی نوعیت ہر وقت اور ہر حالت میں یکساں رہتی ہے اس لیے انسان کا اعتقادِ الٰہی بھی ہمیشہ یکساں رہا۔ اس میں ذہن وفکر کے تغیرات مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

مگر خدا کی ہستی کا تصوّر اس کی صفات کے تصوّر سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انسانی عقل ذاتِ مجرّد کے تصوّر سے عاجز ہے۔ وہ جب کبھی کسی چیز کا تصوّر کرتی ہے تو گو اسکی ذات کا تصوّر کرنا چاہے لیکن تصوّر میں اسکی صفات ہی آتی ہیں۔ اور صفات ہی کے جمع وتفرقہ سے ذات کے تصوّر کا نقشہ وجود میں آتا ہے۔ اور یہاں

ہی سے اس فطری جذبہ میں انسانی عقل کی مداخلت شروع ہوئی اور یہی اس کی درماندگیوں اور غلط اندیشیوں کی سب سے پہلی ابتدا ہے۔ فطرت کے جذبۂ یقین نے ایک بالاتر ہستی کے اعتراف کا ولولہ پیدا کیا تو ذہن و فکر نے چاہا کہ اس کا تصوّر کرے۔ لیکن جب تصوّر کیا تو یہ اس کی ذات کا تصوّر نہ تھا۔ بلکہ اس کی صفات کا تصوّر تھا وہ یکے بعد دیگرے صفاتِ الٰہی کے نقشے کھینچتا چلا گیا اور اپنی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنے خالق و معبود کی شکل و شباہت بھی بدلتا گیا۔ اور ہر تبدیلی کے بعد وہ ایک نئی صورت کا خدا اپنے سامنے دیکھتا مگر نہیں سمجھتا کہ یہ صورت اس کے خدا کی صورت نہیں ہے، خود اسی کے ذہن و ادراک کی صورت ہے۔ خداوند عالم کی صورت ایک ہی تھی۔ لیکن اس کی نظر ہمیشہ یکساں نہ تھی۔ نظر و مشاہدہ میں جیسی جیسی تبدیلیاں ہوتی گئیں منظور و مشہود بھی بدلتا گیا۔ اس راہ میں عقلِ انسانی کی پہلی اور بنیادی درماندگی یہی ہے:۔

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرقِ من و تمثیل من

عقلِ انسانی کا ادراک محدود تھا۔ اس کے تصور کے سامنے محسوسات کی دیوار کھنچ گئی تھی۔ وہ حواس کے دائرہ میں محصور اور حدوث و امکان کی جبلّی بندشوں میں اسیر تھا۔ وہ صرف محسوسات ہی کا تعقل کر سکتا تھا۔ اور انہی کی شکل و شباہت میں ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ صحیح تصوّر کسی اَن دیکھی شے کا نہیں ہوتا۔ پھر اس کے عقل و ادراک کی یہ جتنی بھی رسائی تھی یہ ایک دفعہ کام نہیں دے سکتی تھی۔ نشو و نما اور ارتقاء کی محتاج تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جونہی فطرت کے مجرّد جذبہ سے ذہن و فکر کی صورت آرائیاں اور شبہات آفرینیاں ملیں خدا کے تصوّر کی جگہ ایک ایسی ہستی کا تصوّر پیدا ہو گیا جو خالق کا تصوّر نہ تھا بلکہ خود انسان کے ذہنی تصوّرات کی مخلوق تھا۔ وہ اپنے ادراک کے آئینہ میں خود اپنے چہرے کا عکس دیکھتا اور اسی کو اپنا معبود سمجھ کر سربسجود ہو جاتا۔ اس کا دل ہمیشہ خدا کی صورت دیکھنے کا متمنّی ہوتا۔ مگر اس کا دماغ ہمیشہ اپنی ہی صورت کی پرستش کرتا۔ مولانا روم نے مثنوی شریف میں ایک چرواہے کی حکایت سے جس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ فرض کیا گیا ہے اسی حقیقت کی جانب اشارہ فرمایا ہے:۔

اے کہ اندر چشمۂ شور ست جات   تو چہ دانی شط و جیحون و فرات

چوں قدم آمد حدث گردد عبث ۔۔۔ پس کجا داند قدیمی را حدث!

چوں توہم میکنی تو نور ذات ۔۔۔ ذات نبود وصفِ اسماء و صفات

وہم مخلوق است و مولود آمد است ۔۔۔ حق نزائید است اولم یولدست

بہر حال خدا کی ہستی کے اعتراف ویقین کے فطری جذبہ نے جب تصور کی شکل اختیار کی تو یہ ذہن وفکر کا عمل تھا اور ضروری تھا کہ اس کی حالت اور استعداد کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ترقی ہوتی رہتی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اگر آج انسان کے تمام الٰہی تصوّرات یکے بعد دیگرے سامنے لائے جائیں تو وہ انسانی ذہن کے سلسلۂ ارتقا کی سب سے زیادہ واضح تاریخ ہوگی۔ اور وہ اگرچہ بظاہر خدا کے تصور کا ارتقاء ہوگا لیکن بہ باطن خود ذہنِ انسانی کے ارتقاء کے تمام حلقے ایک ایک کرکے سامنے آجائیں گے۔

یہاں یہ ذکر کردینا خالی از مقصد نہ ہوگا کہ انسانی ذہن وفکر کی اس درماندگی میں وحی ونبوت کی دستگیری ہمیشہ نمایاں ہوتی رہی۔ لیکن وہ اس راہ میں عقلِ انسانی کی اسی حد تک رہنمائی کرسکتی تھی جس حد تک اسکی استعداد ساتھ دینے کے لیے تیار تھی۔ یعنی انبیاء کرام علیہم السّلام کی تعلیمات کا پیرایہ واسلوب بھی دراصل ان کے زمان ومکان کی عقلی استعداد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ مجمعِ انسانی کے معلّم ومربّی تھے۔ اس لیے اسی درجہ کا سبق دے سکتے تھے۔ جس درجہ کے فہم وتحمّل کی استعداد مخاطبین میں پیدا ہوگئی تھی۔

اس سلسلہ میں تصورِ الٰہی کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اگر نوعِ انسانی کے تصورِ الٰہی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اگرچہ اس کی نوعیت کی بے شمار صورتیں اور قسمیں سامنے آئیں گی لیکن بڑی اور اصولی تقسیم دو بنیادی نوعیتوں کی بنا پر ہی کی جاسکتی ہے:۔

۱۔ تجسّم اور تنزّہ

۲۔ صفاتِ جلالیہ اور جمالیہ۔

گویا ذہنِ انسانی نے جب فطرت کی آواز سُنی اور خدا کا تصوّر کرنا چاہا تو وہ بغیر شکل وشباہت کے اس کا تصور نہ کرسکا۔ یہی تجسیم اور تمثیل کی بُنیاد ہے۔ یعنی خدا کے لیے ایسی صفات تجویز کرنا جیسی صفات مخلوقات وموجودات کے لیے ہم محسوس کر رہے ہیں۔ پھر چونکہ اس کا ذہن وفکر عہدِ طفولیت میں تھا

اور نشو و ارتقا کے لیے ایک طولانی عمر کا محتاج تھا۔ اس لیے اس شکل و شباہت کا نقشہ بھی زیادہ شائستہ اور بلند نہ کھینچ سکا۔ وہ درحقیقت اپنی ہی صفات کا عکس تیار کر رہا تھا۔ چونکہ اس کی صفات ابتدائی عہد کے ناقص اور ادنیٰ درجہ میں تھیں اس لیے ویسی ہی صفات سے اس نے اپنے خدا کا خد و خال بھی آراستہ کیا۔

یہ صفات ابتدا میں سر تا سر قہر و جلال کی صفات تھیں۔ پھر ان میں رحم و جمال کی بھی آمیزش ہوئی لیکن غلبہ قہر و جلال ہی کو رہا۔ اس کے تصوّر میں پہلے دہشت آئی۔ پھر امید نے ظہور کیا۔ یعنی وہ پہلے خدا سے صرف ڈرتا تھا۔ پھر امید کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ محبّت کرنے لگا۔

چنانچہ اس سلسلہ کے ارتقائی تغیّرات میں یہی دو باتیں سب سے زیادہ نمایاں اور بمنزلہ اصل و معیار ہیں۔ اس سلسلہ کی ابتدا تجسّم اور قہر و جلال سے ہوتی ہے۔ اور تکمیل تنزّہ اور رحمت و جمال پر۔ درمیان کی تمام کڑیاں ارتقائی کڑیاں ہیں اور جوں جوں انسان کی معنوی استعداد ترقی کرتی گئی وہ تجسّم سے تنزّہ کی طرف اور صفاتِ قہر و جلال سے رحمت و جمال کی طرف ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ تکمیل کی آخری منزل نمودار ہو گئی۔



خدا کا تصوّر اور غیر مذاہب

معبودِ حقیقی کی عظمت کا اظہار کرنے کے لیے خدا کا تصوّر اور غیر مذاہب کا مضمون ایک نہایت ضروری بحث ہے کیونکہ معبود کا محض اقرار الگ حقیقت ہے اور حقیقتاً اس کو اس کی شان کے مطابق ماننا الگ ۔ جتنے مذاہب اسوقت ہمارے سامنے ہیں اُن کے محرّف نظریات معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے ۔ کہ ان میں ساری کائنات کے خالق و مالک کے لیے کیا عقیدہ تراشا گیا ہے اور اسکی ذات وصفات میں کس قدر بے معنی اور نحیف تخیّل سے کام کیا ہے ۔ وہ خامیاں اور وہ کمزوریاں اس کی ذات سے منسوب کردی گئی ہیں جو ایک کمزور ترین مخلوق کی جانب نسبت کرتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ ہوتی ہے ۔ گویا ان مذاہب کے ماننے والے یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہ خدا جو اشرف المخلوقات کا خدا ہو سکتا ہے اسکی شان وآن کس بلندی کی مستحق ہے اور کس طرح اس پر ایمان لانے سے ہم اپنا حقِ عبدیت ادا کرسکتے ہیں ۔

اس بحث میں توحید اور صفاتِ ربانی پر روشنی ڈال کر ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام صفاتِ ربّانی پر کس طرح لب کشائی کرتا ہے ۔ اور دیگر مختلف مذاہب جو اپنے گمراہ کُن خیالات میں مبتلا ہیں کیا اظہار کرتے ہیں۔ اور یہ حقائق بفضلہ تعالیٰ کسی تعصب اور جانبداری پر مبنی نہ ہوں گے ۔

عیسائیت دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب ہے لیکن دعوائے توحید پرستی کے باوجود یہ گوناگوں گمراہیوں پست خیالیوں اور مشرکانہ عقیدوں میں گرفتار ہو گیا ہے ۔ ان کا یہ عقیدہ کہ حضرت مسیح علیہ السّلام خدا کے بیٹے ہیں اور دنیا کو نجات دلانے کے لیے بحیثیت خدا ہی کے آئے ہیں ایسا بودا اور لغو عقیدہ ہے کہ جس پر کوئی سلیم العقل انسان صاد نہیں کرسکتا ۔ قرآنِ کریم کیا پاکیزہ اور شُستہ الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے بیٹے مسیحؑ صرف ایک رسول ہیں ۔ ان سے پیشتر بھی بہت سے رسول ہو چکے ہیں اور ان کی والدہ

بھی صدیقہ اور سچی بندی تھیں اور ماں بیٹے دونوں آدمیوں ہی کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ غور کرنے والی آنکھ کو دُنیا میں ہی سب کچھ نظر آسکتا ہے۔ موجوداتِ عالم میں شمس وقمر، آب وہوا، کوہ ودشت پائے جاتے ہیں۔ جن کی عمریں بہت حدتک غیر محدود ہیں۔ ابتداء سے ہیں اور انتہا تک رہیں گے۔ اس لیے ان کی بقائے نسل کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ بخلاف نباتات وحیوانات کے جو محدود اور بہت مختصر عمر لے کر آتے ہیں اور بہ تعجیل یا بدیر کچھ وقت گزار کر فنا ہو جاتے ہیں، قدرت نے ان کی بقائے نسل کا انتظام فرما دیا ہے۔ جو نہایت محکم انتظام ہے۔ اب اگر خدا کے ہاں اولاد تسلیم کر لی جائے اور دوسری جانب اس کے متعلق ازلی ابدی قادرِ مطلق اور غیر مخلوق ہونے کا عقیدہ بھی ہو تو یہ کیا توحید پرستی ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن کا بیٹا ہے ان سے فرما دیجئے کہ یہ ایسی سخت اور گستاخانہ بات تم نے گھڑ لی ہے جس میں تعجب نہیں کہ آسمان ٹوٹ پڑے، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پھٹ کر گر پڑیں۔ تم خدائے رحمٰن جلّ وعلاشانہٗ کے بیٹے بتلاتے ہو، حالانکہ یہ امر اس کی شان سے بعید ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ اگر اور خدا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق سے متعلق ہوتا، اور اس کو لیے لیے پھرتا۔ باہم جنگ وجدال بھی ہوتا اور نتیجہ میں ایک دوسرے پر غالب بھی آتا۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات ان باتوں سے بری ہے۔ اور وہ عالم الغیب ہے اور لوگوں کے شرک سے منزہ ہے۔

شام کے ایک مشہور عربی اخبار (الکوبل کے ایڈیٹر نجیب آفندی) جو ایک عرب عیسائی ہیں، اپنی ایک اشاعت میں اسلام کے متعلق یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ میرے نزدیک اسلام ہی ایک وہ سورج ہے جو قیامت تک اپنی تیز اور نورانی کرنوں سے شرک و بدعت کی تاریکیوں کو زائل کرتا رہے گا۔ میں ہر اُس مسیحی بھائی سے جس کے دل میں ذرہ بھر بھی عقل وشعور کا مادہ موجود ہے اپیل کروں گا کہ وہ مسیحی مذہب کے زہر آلود اور جعلی اقوال وآیات سے متاثر ہونے سے پہلے قرآنِ حکیم، اسلام اور بانئِ اسلام کی تعلیم پر غور فرمائیں اور میں باقی تمام غیر مسلم برادران کو بھی تاریخ اسلام کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہوں۔

پھر کپتان ایزک ٹیلر جو بڑے محقق پادری ہیں عیسائیت اور اسلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ شیوعِ مذہب

کے لحاظ سے دُنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر بالمقابل عیسائی مذہب کے اسلام کو زیادہ کامیابی ہوئی۔ اور عیسائی مذہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام بُت پرستوں ہی نے زیادہ قبول نہیں کیا بلکہ غیر ممالک سے عیسائی مذہب خاص طور پر فی الواقع اٹھتا جاتا ہے اور اسلام نشیب کے پانی کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ مغربی تہذیب ہندو دھرم کو جڑ سے اکھاڑ کر مذہب اسلام کے لیے راستہ صاف کر رہی ہے۔ اسلام نے بہ نسبت عیسائی مذہب کے تعلیم پھیلانے میں زیادہ کوشش کی ہے۔ اسلام میں باہمی مساوات کا برتاؤ ہوتا ہے۔ تمام مسلمان صحبت میں یکساں سمجھے جاتے ہیں اور یہ اسلام میں ایک ایسی چاشنی ہے جسکو دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ جو شخص مسلمان ہوتا ہے خواہ وہ کتنے ہی ادنیٰ طبقہ سے کیوں نہ ہو فوراً برادری میں داخل ہو جاتا ہے۔ اہل اسلام کے اخلاق عیسائیوں کے اخلاق سے بہتر ہیں۔ اسلام کی فتح آج تلوار سے نہیں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ سے ہو رہی ہے۔ ایک اور پادری ہومر صاحب جو لندن کی آل اینگلو کرسچن کانفرنس کے وائس پریذیڈنٹ ہیں لکھتے ہیں کہ مسیحی نوجوانوں کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہے۔ اور اسکی تمام تر ذمہ داری ان پادریوں کے سر ہے جنہوں نے عوام الناس کو مسیحیت کا غلط مفہوم سمجھا کر عیسائیت سے متنفر کر دیا ہے۔ اور بائیبل سے کئی آیات معترفہ اڑا کر ان کی جگہ بناوٹی اور جعلی آیات ٹھونس دی ہیں۔ جن سے لوگوں پر بُرا اثر پڑا ہے۔

الغرض مذکورہ بالا بحث سے اس امر کو خود عیسائی محققین کی شہادتوں نے ثابت کر دیا ہے کہ عیسائیت میں معبودِ حقیقی سے کس قدر دوری ہے اور اسلام اس کے مقابلے میں کس قدر بلند نظریہ رکھتا ہے۔ انہوں نے اقانیم ثلاثہ (تین اقنوم) پر ایمان ضروری سمجھا ہے اور خداوند عالم مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تینوں کو خدا قرار دے دیا گیا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ تینوں کو ایک اور ایک کو تین۔ تثلیث میں توحید اور توحید میں تثلیث گویا شرک اور توحید میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔

دوسرا بڑا مذہب بدھ مت ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے بیشمار فرقوں میں اکثریت ایسے فرقوں کی ہوگئی ہے جو سر تا سر دہریہ ہیں۔ البتہ مہاتما بدھ کے اپنے متعلق یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ موحد تھے اور اب بھی ان کی تعلیم میں ہستیٔ باری تعالیٰ کا تصور موجود ہے۔ مگر عقائد کی نوعیت بدل جانے اور فرقوں کی کثرت و فراوانی سے کچھ ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی اور اسکے معتقدین

نے ان کی تعلیم پر ایسے نہ بہ تہ پردے ڈال دیئے ہیں کہ ان میں توحید و شرک تو درکنار خود مہاتما بدھ ہی نظر نہیں آتے۔

ہندوؤں میں ہزاروں فرقے موجود ہیں جن میں دیوسماجی تو ہستی باری تعالیٰ کے قطعی منکر ہیں اور ایسے منکر کہ مشرکین بھی ان سے دس قدم پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں ہندوؤں میں ایک آریہ سماجی ہیں جو عقیدۂ توحید کے قریب معلوم ہوتے ہیں مگر ربّ العزت کی قدرت کے متعلق انکا نظریہ بھی جداگانہ ہے۔ مثلاً آریہ سماج کے ویدک ایشور نے رگ وید کے ایک منتر میں خود بتایا ہے کہ میرے رہنے کا استھان سمندر کے پانی میں ہے۔ اور حلیہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ دن اور رات اس کی بغلوں کی مانند ہیں۔ سورج اور چاند اس کی آنکھیں ہیں، سورج کی دھوپ اور بجلی کی چمک اس کے ہونٹ ہیں اور زمین اور سورج کے درمیان کا فاصلہ اس کا منہ ہے۔ پھر یجروید سے معلوم ہوتا ہے کہ ویدک ایشور کے چار حصے ہیں جن میں سے ایک حصہ اس کائنات کا ہے اور باقی تین حصے اس سے اوپر ہیں۔ چاند ویدک ایشور کے مغز سے نکلا ہے۔ وایو اس کے کان سے نکلے ہیں اور آگ اس کے منہ سے نکلی ہے۔ کبھی ویدک ایشور غصہ سے بھر کر گھوڑوں، گئوں اور بچوں میں گھس جاتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ مذکورہ بالا تعلیم کے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ البتہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس تعلیم کو خدائی تعلیم سمجھنا علم و عقل اور اخلاق و روحانیت کی انتہائی توہین ہے۔ اس تعلیم سے معرفتِ الٰہی تو کیا ہوگی انسانیت تباہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ ان کے نزدیک اس کی کوئی تاویل و تحریف ہو سکتی ہو جس سے وہ ان لغویات کو خوش فہمی کے پردے میں چھپا سکیں۔ مگر بعض مسائل ایسے ہیں جن میں کوئی تاویل و پھر تحریف نہیں چل سکتی۔ اور نہ وہ اس کو مذہبی مسئلہ ماننے سے انکار کر سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) پرمیشور کے معنے ہی سن لیجئے۔ یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک پرم بمعنی بڑا۔ دوسرا ایشور بمعنی شہوتی۔ ان دونوں کے ملانے سے اس نام کے معنے ہوئے بڑا شہوتی۔ بتایئے کون عقلمند ہے جو توحید پرست بن کر ایسے نام کو اسماء الٰہی میں شمار کرے۔

(۲) پھر آریہ سماجی ایک طرف تو توحیدِ الٰہی کے قائل ہیں اور خداوندِ عالم کو واحد بھی مانتے ہیں۔ اور بت پرستی کے مخالف ہیں۔ مگر باوجود اس کے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ روح اور مادہ ازلی و ابدی ہیں۔

جس کا مطلب یہ ہُوا کہ خدا کی مخلوق نہیں بلکہ دونوں ہی خدا کی طرح واجب الوجود اور قائم بالذات ہیں جس سے ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا ہے کہ آریہ جس توحید کو پیش کر رہے ہیں وہ ایک کھُلی گمراہی اور صریح شرک ہے، توحید نہیں ہے۔

جینی طبقہ بھی ہندوؤں میں شمار ہوتا ہے مگر خدا کا منکر کہا جاتا ہے کہ ان میں بھی ایک فرقہ ایسا ہے جو ایک حد تک خدا کی ہستی کو تسلیم کرتا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ یہ ہندو قوم کتنے عقیدوں کے افراد پر مشتمل ہے اور پکا ہندو کسے کہتے ہیں جو خدا کا ماننے والا ہے وہ بھی ہندو اور جو منکر ہے وہ بھی ہندو۔ جو گائے کا گوشت کھاتا ہے وہ بھی ہندو اور جو اسکی تقدیس پر اس کا گوشت نہیں کھاتا وہ بھی ہندو ہے۔ روٹی بیٹی کا کوئی دھرم نہیں۔ جہاں سے مل جائے پوتر ہے اور جس کو دے دی جائے پاک اور طیب، سوچا جائے کہ ان میں حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔ خدا کی پناہ یہ مذہب مہنتوں، پنڈتوں اور پروہتوں کی کھچڑی بن کر رہ گیا ہے۔

یہودی بھی موحد ہیں اور تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔ آج ان کے اندر کوئی فرقہ خداوندِ عالم کا منکر نہیں پایا جاتا البتہ چوتھی صدی ہجری تک ان میں بھی ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتا تھا، مگر یہودیت کی شکست کے ساتھ وہ بھی نظر نہیں آتا اور نابود ہو گیا ہے۔ مجوسیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک یزداں دوسرا اہرمن۔ گو دونوں ازلی ابدی ہیں مگر کام اُن کے جدا جدا ہیں۔ ایک خیر (نیکی) کا مالک ہے اور دوسرا شر (بدی) کا۔ ایک بناتا ہے دوسرا بگاڑتا ہے۔ اسی نظریہ کی قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں تردید فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے "لوگو دو دو خدا نہ بناؤ حقیقت میں خدا ایک ہی ہے اگر زمین و آسمان میں دو خدا ہوتے تو فساد ہوتا۔

سبحان اللہ قرآنِ کریم نے نہ صرف عقیدۂ توحید کو صاف کیا ہے۔ بلکہ صفاتِ باری تعالیٰ پر بھی بفصاحت سے ایسی روشنی ڈالی ہے جس کی مثال کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ تعریف و توصیف اسی معبود کی ہے۔ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ رحمٰن اور رحیم اور مالکِ یومِ حشر ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ذات جسکی عبادت کی جائے۔ رب کی شانِ ربوبیت یہ ہے کہ تدریجی ترقی دے کر منتہائے کمال کو پہنچا دے۔ اس اسمِ پاک میں رزاقیت اور پرورش کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اور یہی صورت نباتات و حیوانات کے تعلق میں بھی نظر آتی

ہے۔ ایک تخم یا بیج تدریجی طور پر اس کی ربوبیت کے عمل سے نشو ونما پا کر ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ رحمٰن کی شانِ رحمانیت یہ ہے کہ محض اپنے فضل وکرم سے بذل وعطا کا سلسلہ جاری رکھے۔ اور بے محنت و بے استحقاق بخشش کرے۔ اور اسی طرح شانِ رحیمیت کا ظہور ہوتا ہے۔ کہ وہ رحیم خدا انسان کی صحیح کوششوں کو برباد نہیں ہونے دیتا اور کامیاب اور فائز المرام فرماتا ہے۔ مخلصانہ طور پر نیکی اور نیکی کرنے والوں کے اجر کو نہ ضائع ہونے دیتا ہے اور نہ ضائع فرماتا ہے۔ وہ معبودِ حقیقی اپنی ذات وصفات میں یکتا اور یگانہ ہے۔ بے نیاز ہے نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔ نہ اس کی برادری و کفو ہے اور نہ ہمسر و برابر۔ آسمان وزمین کو وجود میں لانے والا وہی ہے اور اس کے ہاں اولاد کا ہونا ممکن ہی نہیں اس کی کوئی بیوی نہیں اور نہ کبھی تھی۔ ہر چیز کو اسی نے پیدا فرمایا ہے۔ پھر قرآنِ کریم نے آیۃ الکرسی میں اس کی صفات وذات پر نہایت تیز روشنی ڈالی ہے اور تمام شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر ہوتا چلا گیا ہے اور اسی واحد مالک الملک کی سلطنت اور ہمیشہ اسی کا سکہ رواں ہونے کے دلائل نہایت دلربائی سے واضح فرمائے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ خدائے کائنات کا صحیح تصور اگر دنیا کے سامنے رکھا ہے تو صرف اسلام اور قرآن نے رکھا ہے۔



توحید، موحد اور مسئلہ وحدت الوجود

عقلی اور نقلی دلائل سے رب العزت جلّ وعلیٰ شانہٗ کو ایک جاننا یا شہودِ اشیاء موجودات سے ذات واجب الوجود کی یکتائی کا اقرار کرنا توحید علمی ہے اور توحیدِ ذات یہ ہے کہ کثرت میں وحدت نظر آئے۔ اہل اللہ میں اپنے وجود کے ادراک کی ایسی نفی کرنے کو توحیدِ حقیقی کہتے ہیں کہ ہستیٔ حق کے سامنے تعینات کی ہستی مفقود اور نابود ہو جائے اور رضا کے بعد حضرت احدیت کا وہ قرب و اتصال نصیب ہو۔ جس کو حیاتِ ابدی اور بقائے سرمدی کہتے ہیں فی زمانہ وہ لوگ موحد کہلاتے ہیں جن کو حقائق توحید سے قطعاً کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ لوگ مسئلۂ توحید باری تعالےٰ سے بالکل ناآشنا ہیں۔ حقائق توحید کا انکشاف موحّد کی نیازمندی سے ہوتا ہے۔ سچا موحد وہ ہے جس کا آخر اوّل کی طرف عود کر آئے اور ایسا ہو جیسا ہونے سے پہلے تھا۔ توحید کا علم پا لینے والا موجودات کی یاد کو دل سے محو کر دیتا ہے اور خود خدائے واحد کے ساتھ منفرد رہ جاتا ہے۔ اس کیفیت سے جن کو بندے کے خدا ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ عقیدہ رکھنے لگتا ہے کہ بندہ ہی خدا ہے وہ ایک ایسے مخمصے میں گرفتار ہے جس سے جہالت کی وادی قریب ہے۔ اسلام نے مسئلۂ توحید کو بڑا بلند مقام دیا ہے۔ مگر افسوس نادانوں نے اس کو بازیچۂ اطفال سمجھ کر یوں عمل کیا کہ الفاظ ہی کے ذخیرہ میں الجھنا اور عقل کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو کر کلام کرنا موحد کی شان امتیازی قرار دے دی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ وحدت الوجود کی غلط تعبیر سے اکبر کے عہد میں بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں اور شریعت اور شعائرِ شریعت کا استہزا درباری دین میں داخل ہو گیا۔ امام ربانیؒ اس کی اصلاح کے لیے اُٹھے۔ ان کے والد ابن عربی کے طریقے پر تھے۔ شروع میں خود امام ربانیؒ بھی وحدت الوجود کے قائل تھے لیکن بعد میں آپ نے ابن عربی کے اس تصور وحدت الوجود کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ بتایا کہ

کائنات میں جو وحدت ہمیں نظر آتی ہے اس کو وجود اصلی سمجھنا غلطی ہے - وجود حقیقی تو اس سے بہت پرے اور یہ کائنات اس کی تخلیق ہے - جب یہ کائنات موجود نہ تھی تو اس کا وجود تھا - اس لیے کائنات اور یہ وجود ایک نہیں ہو سکتے - ایک خالق ہے ایک مخلوق - ایک معبود ہے اور دوسرا بندہ چنانچہ فرماتے ہیں "اِنَّ اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ وراء الورا ثم وراء الورا ثم وراء الورا" یہ ہے عقیدہ وحدت الشہود جو امام ربانیؒ نے ابن عربی کے عقیدہ وحدت الوجود کے رد میں پیش کیا - وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں جو فرق ہے اس کو سمجھنے کے لیے "Philosophy of Faqirs" "فلسفۂ فقراء" کے مصنف سر احمد حسین نواب امین جنگ بہادر کے اس بیان سے بڑی مدد ملتی ہے - موصوف نے دونوں رجحانات کو ایک نقشہ کی صورت میں پیش کیا ہے - ملاحظہ ہو:-

وحدت الوجود (ہو الکل)	وحدت الشہود (ہو الباری)
نظریہ:- ہمہ اوست یا اندر ہمہ اوست۔	**نظریہ**:- ہمہ از اوست۔
ارتقا:- خود بخود ہوتا ہے۔	**ارتقا**:- پیدا کیا جاتا ہے۔
رجحانِ تصوّف:- سکون کی طرف مائل، میں اور وہ جدا نہیں۔ (وہ دریا تو میں قطرہ ہوں)	**رجحانِ تصوّف**:- جوشش کی طرف مائل، اس کے ساتھ میں اور میرے ساتھ وہ ہے۔
وصل	عشق
حقیقت:- حق، حق، حق	**حقیقت**:- حسنِ ازل - محبوبِ کل
اعتقاد:- میں کون؟ انا الحق (عارف)	**اعتقاد**:- میں کون؟ انا عبدہٗ (عاشق)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ ابن عربیؒ اور امام ربانیؒ دونوں سے مستفید ہوئے - آپ کے نزدیک امام ربانیؒ جس کو وحدۃ الشہود کہتے ہیں یہ تصورِ توحید خود ابن عربی کے ہاں موجود ہے - بے شک ابن عربی کے تصور سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں - امام ربانیؒ نے اُن کی اصلاح فرما دی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ابن عربی کا تصور وحدت الوجود غلط تھا - شاہ صاحب کے خیال میں خود ابن عربی بھی کائنات کو خالقِ کائنات کے مرادف نہیں سمجھتے لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ آخر یہ کائنات جس وجود سے نکلی ہے وہ وجود اللہ کے ماسوا کوئی دوسرا وجود تو نہیں ہو سکتا ہے - اس کائنات اور خالقِ کائنات میں کیا تعلق ہے - شاہ صاحب نے اس کو تجلی کے

ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تجلّی کی حقیقت سمجھ لینے سے وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں تعارض نہیں رہتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہلِ فکر کے نزدیک خدا جسمانیت سے اتنا مجرّد ہے کہ انسانی حواس اس کا کسی طرح ادراک نہیں کر سکتے۔ اب دوسری طرف انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو دیکھیے، نبوّت کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے حامل نے خدا کی کوئی بات سُنی۔ شاہ صاحب کے تصوّف کا یہی کمال ہے کہ وہ تجلّی کے ذریعے سمجھا دیتے ہیں کہ بندہ کس طرح خدا کی بات سن سکتا ہے۔ اور اسے دیکھ سکتا ہے۔ خدا کا تجلّی جس مظہر پر عکس ریز ہوتا ہے وہ مظہر خود اس تجلّی کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اور وہ مظہر خود صاحبِ تجلّی کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کو دیکھا یا اس کی بات سُنی۔

اس کی ایک ناقص مثال یہ ہے کہ آئینہ میں ہم آفتاب کے عکس کو دیکھتے ہیں۔ اب اگر اس عکس میں ہم اتنے منہمک ہو جائیں کہ آئینہ کا تصوّر ہی ذہن سے محو ہو جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ اس کے خلاف کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے جو دیکھا ہے وہ آفتاب نہیں۔ یا یہ وہی آفتاب ہے۔ اگر تجلّی کی حقیقت سمجھ میں آجائے تو کلام اللہ، بیت اللہ اور رسول اللہ کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور مامون الرشید کے زمانہ میں قرآن کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کا جو نزاع ہے اس کا بھی حل نکل آتا ہے۔

ہماری کائنات آفتابِ حقیقت کے لیے ایک آئینہ کے مانند ہے کبھی ہم آئینہ میں آفتاب کے عکس کو آفتاب کہہ لیتے ہیں۔ یہ وحدت الوجود کا عینیت کا تصوّر ہے اور بعض دفعہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ آفتاب عکس ہے۔ اصل آفتاب کا جو بہت دور اور بعید الحصول ہے۔ یہ ہے وحدت الوجود کا ورائیت کا تصوّر۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن عربی کے ہاں یہ دونوں تصورات ہیں اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔

تجلّی کی ماہیت سمجھے بغیر ذاتِ احدیت کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایک آئینہ پر آفتاب کی تجلّی پڑتی ہے۔ اسی طرح جب انبیاء کا دل خدا کے تجلّی کا مقام بن جاتا ہے تو اس وقت مولانا رومؒ کے قول کے مطابق ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

طور پر خدا کا تجلی نازل ہوا تو موسیٰ کو "انا ربک" کی آواز آئی۔ یہ آواز طور کی نہ تھی بلکہ خدا کی تھی کائنات کو عین ذات ماننے والے کائنات کو تجلی الٰہی کا مظہر جان لیتے ہیں۔ لیکن صحیح ادراک رکھنے والے اس کائنات کو آئینہ سمجھتے ہیں اسے اصل حقیقت نہیں مانتے۔

یہ بحث نامکمل رہ جائے گی اگر ہم یہاں سر احمد حسین مصنف "Philosophy of Faqirs" "فلسفۂ فقرا" کے ان افکار کا ایک اقتباس نہ دیں جو موصوف نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے متعلق حیدرآباد کے انگریزی رسالہ اسلامک کلچر میں ایک مضمون "مجدد الف ثانیؒ کا نظریۂ توحید" پر تبصرہ کے سلسلہ میں ظاہر کیے تھے۔ شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں۔ "صاف ظاہر ہے کہ ابن عربی نے علم کے ذریعہ حقیقت کی گتھی کو سلجھانا چاہا تھا۔ چونکہ علم کثرت کو ہمیشہ وحدت کے ذیل میں جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے قدرتی طور پر ابن عربی اس نتیجے پر پہنچے کہ مظاہر کی بو قلمونی ایک ہی وجود کا حاصل ہے اور ان سب کی اصل ایک ہی وجود ہے۔ یہ ہے ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا تصورِ توحید۔ اس کے برعکس مجدد الف ثانیؒ نے عشق و محبّت کی مدد سے اس عقیدہ کو حل کرنا چاہا، چونکہ عشق و محبت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک چاہنے والا ہو اور ایک وہ جس کو چاہا جائے اور لازمی ہے کہ دونوں الگ الگ ہوں کیونکہ اگر وہ ایک ہو جائیں تو محبت کا جوش و خروش نہیں ہو سکتا۔ یہی رجحان (کتاب مذکورہ بالا کے صفحہ نمبر ۷۵ پر بتایا گیا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ علم و عقل، جذب و محبت اور عمل) اس خیال کا باعث ہوا کہ اللہ اللہ ہے اور بندہ بندہ۔ ایک خالق و مختار اور دوسرا مخلوق و نیاز مند۔ ایک مستغنی اور دوسرا محتاج دونوں نہ کبھی ایک تھے اور نہ کبھی ایک ہوں گے۔ یہ ہے ہمہ از اوست یا وحدت الشہود کا عقیدہ یعنی خدا تعالیٰ کا پرے۔ پرے سے پرے اور پرے سے پرے سے اور پرے ہونا۔ لیکن حقیقت کے جویا افراد کا ایک اور گروہ بھی ہے جن کی قیادت کا فخر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو حاصل ہے۔ ان کے نزدیک ہمہ اوست یعنی وحدت الوجود اور ہمہ از اوست یعنی وحدت الشہود میں کوئی فرق نہیں۔ یہ لوگ عمل اور خدمت کے ذریعہ جو حقیقت کے حرمِ ناز میں بار پانے کا تیسرا راستہ ہے۔ خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ محبت ہمیشہ ہم جنسوں میں ہی ہوتی ہے اس لیے یہ کائنات کو اصل وجود سے نکلا ہوا مانتے ہیں۔ بیشک

ان کے نزدیک خدا ایک ہے، وہ بے مثال ہے۔ فہم وادراک سے بالاتر ہے لیکن اس کائنات کا اسی سے صدور ہوا۔ ہو رہا ہے اور برابر ہوتا رہے گا یہ کہتے ہیں کہ خدا اور کائنات کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسے جسم اور روح کا ہوتا ہے یا زمان ومکان کا بظاہر دیکھنے میں الگ الگ لیکن حقیقت میں ایک"

سر احمد حسین لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا تصوّر کائنات کہ اصل وجود سے ہر لمحہ نمو حرکت اور ارتقا کا عمل سرزد ہوتا رہتا ہے، یورپ کے مشہور ترین فلسفی ہنری برگسان سے بہت کچھ ملتا ہے۔ بے شک دونوں کے پیرایۂ بیان میں فرق ہے۔ سر موصوف فرماتے ہیں کہ ضرورت ہے کہ تصوّف کے ان حقائق کو جن کی تصدیق اب یورپ کا علم اور فلسفہ کر رہے ہیں اصطلاحات اور الفاظ کے ان گورکھ دھندوں سے نکالا جائے۔ متصوّفانہ اصطلاحات میں تو ان حقائق کو سمجھنا بڑا مشکل ہے لیکن شعرائے متصوفین نے ان مسائل کو آسان بنانے کی بڑی کوشش کی ہے۔

خدا اور کائنات کا تعلق روح اور بدن کا ہے اس مطلب کو مندرجہ ذیل اشعار میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

حق جانِ جہاں است و جہاں جملہ بدن ارواح و ملائکہ حواسِ ایں تن

افلاک عناصر و موالید اعضا توحید ہمیں است و دیگر شیوہ وفن

وجود سے ہر لمحہ نمو، حرکت اور ارتقا کا عمل سرزد ہوتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز جلد سے جلد بدلتی رہتی ہے کسی کو ثبات یا دوام نہیں۔

بحر یست نہ کاہندہ نہ افزائندہ امواج بر آورندہ و آئندہ

عالم چوں عبارت از ہمیں امواج است بنود و زماں بلکہ دو آں پائندہ

اسلامی تصوّف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جس طرح مسلمانوں میں ابن عربی کا وحدت الوجود کا تصورِ توحید تھا اور اس کے خلاف امام ربّانی حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے وحدت الشہود کا خیال پیش کیا۔ بعینہٖ ہندوؤں میں بھی توحید کے دونوں تصورات موجود تھے۔ یہاں ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اسلامی تصوف ویدانت کے فکر سے متاثر ہوا اور ہندوستان کے مسلمان صوفیا نے نفس باطنی کی اصلاح اور تصفیہ کے لیے ہندو یوگیوں سے ملتے جلتے طریقے اختیار کیے۔ بہرحال تھے یہ دونوں معناً الگ الگ۔ ایک کی بنیاد قرآن، حدیث، شریعت، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ اقدس

اور مسلمان صوفیاء کی روایات تھیں اور دوسرے کا ذہنی پسِ منظر بالکل اور تھا۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان میں اسلام ایرانیوں اور ترکوں کے ذریعہ پہنچا۔ خالص عربی اثر سندھ کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکا۔ عباسیوں کا زمانہ آیا تو ہندوستانی افکار یہاں سے بغداد پہنچے اور مسلمانوں نے انہیں اپنے نظامِ تصوف میں جگہ دی۔ ان کے ہاں مثنوی مولوی رومؒ "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" کا درجہ رکھتی تھی۔ مثنوی کی وجہ سے مسلمانوں کے اہلِ علم اور حکمران طبقوں میں وحدت الوجود کا خیال عام تھا۔ چونکہ موجودات کو عین ذات سمجھنے میں ویدانت اور وحدت الوجود میں ایک گونہ مشابہت تھی۔ اس لیے ہندوؤں نے اس فکر کو قبول کیا اور ان کے پڑھے لکھے طبقوں میں مثنوی کا چرچا رہنے لگا۔ کیونکہ ہندوؤں کے لیے تو وحدت الوجود کا تصور ایک طرح سے ان کا اپنا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی صوفیا کا چشتی سلسلہ ابن عربی کے وحدت الوجود سے بہت زیادہ متاثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کو ہندوستان میں تبلیغ میں بھی خاص طور پر کامیابی ہوئی۔ اس کے سلوک کے طریقے ہندی طبائع سے زیادہ قریب ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے بارے میں مشہور مسلمان مؤرخ فرشتہ نے چند ایسے رسالوں کا نام گنایا ہے جو ان کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ اکبرِ اعظم اسی سلسلہ کا معتقد تھا اور اکبر کے دینِ الٰہی میں بہت حد تک اسی عقیدہ وحدت الوجود کی جھلک نظر آتی ہے۔ گو اکبر سے پہلے وحدت الوجود کے خیالات ہندوستان میں موجود تھے اور اس کی بنا پر اہلِ تصوّف میں وحدت ادیان کا خیال بھی عام تھا۔

سب سے پہلے تصوّف کی بطور ایک علم کے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے طرح ڈالی اور بعد میں دوسرے اربابِ تصوّف نے بھی اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھیں۔ ان والا تبار شخصیتوں میں محی الدین ابن عربی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ مسلمانوں میں وہ عقیدہ وحدت الوجود کے سب سے بڑے سرگرم مبلغ ہوئے ہیں اور انہوں نے ہی اس عقیدہ کو علمی طور پر تصوف کی اساس بنایا۔ وہ اس کائنات سے بھی بلند تر ایک تجلّیٔ اعظم مانتے ہیں اور اس تجلّی کو وہ ذات کا عین قرار دیتے ہیں۔ لیکن بعض دفعہ ان کے کلام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کو ہی عین سمجھ رہے ہیں۔ حضرت شاہ محمد حسین صاحبؒ الہ آبادی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں (سوانح حیات مولانا الحاج شہیدِ عشق شاہ محمد حسین صاحبؒ الہ آبادی سن وفات ۱۹۰۴)

"جب ہم موجودات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں دو حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک اشتراک دوسرے امتیاز۔

یعنی ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے مختلف صنفوں میں مشترکہ ہیں۔ مثلاً انسان انسانیت میں مشترک ہے اور اپنے خاص خاص تعینات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ اسی طرح جتنے جاندار ہیں ان سب میں جاندار ہونا مشترک ہے اور انسان اور گھوڑا ہونا ان کو آپس میں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے ممکن میں اور واجب میں دونوں میں وجود پایا جاتا ہے۔ اس وجود سے ہونا مراد نہیں بلکہ وہ حقیقت مراد ہے جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بلا کسی موجود کرانے والے کے موجود ہے۔ اس لیے کہ یہی ذریعہ وجود ہے۔ لہٰذا اسے خود پہلے موجود ہونا چاہیئے۔ اور یہی وجود تمام چیزوں پہ حاوی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر شے معدوم ہے۔

اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں وہ اعتباری ہیں۔ اس لیے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالیٰ کا عین ذات ہے اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے اور ہر چیز کی علیحدہ شخصیت علاوہ وجود کے صرف اعتباری ہے۔"

مطلب یہ ہوا کہ تمام موجودات میں وجود مشترک ہے۔ اگر یہ وجود نہ ہو تو یہ موجودات بھی نہ ہوں۔ اس سے بعض اربابِ تصوف اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا عبارت ہے موجودات سے۔ یعنی خدا نے ان موجودات میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے۔ اس گروہ کو وجودیہ یا عینیہ کہا جاتا ہے۔ لیکن بعض صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ یہ وجود جو سب موجودات میں مشترک ہے اور اسی سے سب موجودات کا قیام اور مدار ہے۔ یہ وجود ایک اور برتر وجود کا فیضان اور پرتو ہے۔ اس گروہ کو ورائیہ کہتے ہیں۔ ورائیہ سے یہ مراد ہے کہ وہ اس کائنات سے ماورا ذاتِ خداوندی کو مانتے ہیں۔

ابنِ عربی کے ہاں یہ دونوں خیال ملتے ہیں۔ کہیں وہ موجودات کو عین ذات کہہ جاتے ہیں اور کہیں ذاتِ الٰہی کو موجودات کا ماورا بتلاتے ہیں۔ مثالیہ طور پر اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ انسان جب اپنے متعلق سوچتا ہے اور وہ اپنے وجود کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہے تو سوچتے سوچتے اس کا خیال اس مقام پر پہنچتا ہے کہ ایک وجود ہے جس سے یہ سب کائنات نکلی ہے۔ یہ وجود ایک ہے اور ساری کثرات اس کا مظہر ہیں یہ عینیہ کا گروہ ہے۔ اور یہ خیال عوام کے ذہن کے بہت مناسب ہے۔ کیونکہ ان کے لیے خدا کا تصوّر ایک

مطلق تجرّد کے طور پر کرنا بڑا مشکل ہے۔ وہ حقیقت کو اگر وہ جسم میں متمثل ہو تو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں مثال کے طور پر ایک گنوار کو ۵ کا عدد بنانے کے لیے ایک، دو، تین، چار۔ پانچ کر کے انگلیوں پر گن کر دکھانا پڑتا ہے اس کا ذہن ۵ کے عدد کا مفہوم ٹھوس جسم کی مثال دیکھے بغیر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں انسان خدا کو مادی مظاہر کی شکل ہی میں پہچان سکا۔

ابن عربی نے اپنے وحدت الوجود کے تصوّر میں عینیت اور ورائیت دونوں کو جمع کر لیا تھا۔ عملی لحاظ سے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے نزدیک صابئی قومیں جو صرف مظاہر قدرت ہی میں خدا کو جلوہ گر مانتی تھیں اور حنفی ملتیں جو خدا کو مظاہر قدرت سے ماوراء جانتی تھیں دونوں کا حق شناس ہونا تسلیم کر لیا گیا۔ ابن عربی کے ان اشعار سے ان کے خیال کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ فرماتے ہیں :-

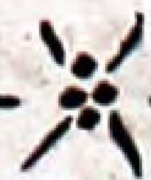
لقد کنت قبل الیوم انکر صاحبی　　اذا لم یکن دینی الی دینہ دانی

وقد صار قلبی قابلاً کل صورۃ　　فمرعی لغزلان ودیر لرھبان

وبیت لاوثان وکعبۃ طائف　　والواح توراۃ ومصحف قرآن

ادین بدین الحب انّی توجھت　　رکائبہ فالحب دینی وایمانی

آج کے دن سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ جس ساتھی کا دین مجھ سے نہ ملتا میں اس کا انکار کرتا اور اسے اجنبی سمجھتا لیکن اب میرا دل ہر صورت کو قبول کرتا ہے۔ وہ چراگاہ بن گیا ہے غزالوں کی اور دَیر راہبوں کے لیے آگ پُوجنے والوں کا آتشکدہ اور حج کا قصد کرنے والوں کا کعبہ۔ توراۃ کی الواح اور قرآن کا صحیفہ۔ میں اب مذہبِ عشق کا پرستار ہوں۔ عشق کا قافلہ جدھر بھی مجھے لے جائے میرا دین بھی عشق ہے میرا ایمان بھی عشق ہے۔



تحقیقِ مقام

اِنسان فطرتاً محسوس پرست واقع ہوا ہے۔ جن لوگوں کو نورِ بصیرت کا کوئی حصّہ ملا ہے وہ اس محسوس پرستی کو چھوڑ کر آگے قدم بڑھانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ غیبی طاقت جسکو نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ وہ ہاتھوں سے چھونے کی چیز ہے۔ نہ اسکی پرستش کرنی اور اس کو پکارنا بغیر کسی تعبیری لفظ کے ممکن ہے۔ اس لیے ایسے الفاظ کی ضرورت ہے جن سے عابد اپنے معبود کو پکار سکے اور خدائے قدوس کی صفات کا اظہار زبان سے کیا جا سکے۔ مگر انسان مادی ماحول رکھنے کی وجہ سے مادی تخیّل میں گرفتار ہے۔ اس کو اگر معبود کے صفات کا بیان کرنا متصوّر ہوتا ہے۔ تو وہی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جن سے اس کے اپنے بہترین صفات کا اظہار ہو سکتا ہو۔ مگر درحقیقت خدا تعالیٰ کے لیے انسانی صفات سے متصف ہونا ایک معیوب بات ہے۔ اس کا ذاتی اور صفاتی تقدس ہر انسانی تخیّل اور مادی قیاس سے بالاتر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر جو اسماء والفاظ دلالت کرتے ہوں۔ ان کی صراحت شریعت کی زبان سے ضروری ہے۔ طبعزاد یا اصطلاحی الفاظ خواہ کتنے ہی تنزّہ اور تقدّس کو پیشِ نظر رکھ کر وضع کیے ہوں ان کا اطلاق بغیر شرعی اجازت وصراحت کے خدا تعالیٰ پر ناجائز ہے علماء اہلِ سنت والجماعت نے اسی بنا پر کہا ہے کہ خداوندِ عالم کے اسماء توقیفی ہیں۔ یعنی شریعت نے اللہ تعالیٰ کے جس قدر اسماء ظاہر کر دیے ہیں۔ انہی سے اللہ کو موسوم کیا جائے۔ اپنی تحقیق اور اپنی طرف سے جدید اسماء وضع کرنا جائز نہیں۔ ہاں اگر عربی زبان کے اسماء کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کر لیا جائے تو جائز ہے۔ مگر اس میں بھی مفہوم ومعنیٰ کی مطابقت بے حد ضروری ہے۔ جیسے اسم اللہ کا ترجمہ خدا، God، بھگوان، پرمیشور، داتا وغیرہ کیا جاتا ہے۔ لفظ خدا سے اگرچہ پورا مفہوم اللہ کا ادا نہیں ہوتا تاہم بقدرِ امکان ترجمہ قریبِ مطلب ہو جاتا ہے اور ایسے ترجمہ کی اجازت ہے۔

اسمار الٰہی تین طرح پر ہیں

ایک اسمِ ذات جس کو عَلم کہا جاتا ہے۔ عَلم صرف اللہ ہے۔ اسم ذات میں کسی صفت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ زندہ اور موجود ہونے کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔ مثلاً "زید" ایک شخص کا نام ہے۔ لیکن اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ زید اب بھی موجود ہے۔ زندہ ہے یا نہیں نہ اس کی کسی دوسری حالت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ عالم، جاہل، سخی، بخیل شجاع، بزدل، نیک اور بد، عقلمند و بیوقوف، یہ تمام صفات مفہوم ذات سے زائد ہیں۔ لفظ زید میں ان کا کوئی لحاظ نہیں۔ دوسرے اسمار صفاتیہ، جو صفت کے صیغے ہیں، جن کا استعمال اللہ کے سوا دوسروں کے لیے بھی ممکن ہے اگرچہ مقدار اور حیثیت صفت میں فرق ہوگا، مگر نفس صفت کا مفہوم مشترک ہوتا ہے مثلاً حَیّ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور زید بھی حَیّ ہے۔ اللہ بھی حَیّ ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی حیات اور زید کی حیات میں بڑا فرق ہوگا۔ ایسے ہی ظاہرؔ و باطنؔ " اسم صفاتی ہیں۔ مخلوق و خالق دونوں پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگرچہ مخلوق کا ظہور و بطون اللہ تعالیٰ کے ظہور و بطون سے بالکل جداگانہ ہوگا جس کی کوئی مناسبت نہیں۔ تیسرے وہ اسما ہیں جو اصل مفہوم اور وضع کے اعتبار سے تو توصیفی ہیں۔ مگر شرعی تخصیص کی وجہ سے وہ بھی اسم ذات کی طرح مستعمل ہوتے ہیں۔ یعنی ایک ذاتِ خدا کے علاوہ مخلوق پر ان کا اطلاق صحیح نہیں۔ مثلاً اسم رحمٰن ہے جس کا وصفی مفہوم کے اعتبار سے تو مخلوق پر بھی اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ مگر شریعت نے چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اس کو مخصوص کر دیا ہے۔ اس لیے یہ اسم اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اسم ذات کی طرح مخصوص ہو گیا ہے۔

الغرض قرآنِ حکیم نے انسان کو خدا کے اعتقاد اور تصوّر کی دعوت دیتے ہوئے سب سے پہلے جن صفات کا حسن و جمال بے نقاب کیا ہے۔ وہ ربوبیت، رحمت اور عدالت تین صفتیں ہیں جن کی وضاحت سورۂ فاتحہ کے مطالعہ سے ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ

یعنی ساری تعریفیں ہر قسم اور ہر طرح کی ثنائیں حسن و جمال کی شیفتگی اور تمام خوبیوں کمالوں کے ساتھ جو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے وہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ وہ اللہ جو تمام جہانوں

کا پرورش کرنے والا ہے جسکی ربوبیت کائنات ہستی کی ہر مخلوق کو اسکی زندگی اور بقا کا تمام سامان بخشتی ہے۔ اور اسکی پرورش کی تمام ضرورتیں مہیا کرتی ہے۔ اور جو رحمت والا ہے جسکی رحمت کی بخشائشیں تمام عالمِ خلقت کو اپنے نوالِ محبت سے مالا مال کر رہی ہیں۔ جس کے قبضہ و تصرّف میں جزا و سزا اور مکافات کا دن ہے۔ اور جس کی عدالت نے ہر کام کے لیے بدلہ اور ہر بات کے لیے نتیجہ کا قانون جاری و نافذ فرما دیا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن سے تصورِ الٰہی کی جلوہ نمائی ہوتی ہے اور انہی کے تفکّر سے ہم قرآن کریم کے تصورِ الٰہی کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نام توقیفیہ ہیں۔ یعنی جن اسماء کو خود رب العزت نے اور اس کے رسول علیہ السّلام نے اسماء الٰہی بتایا ہے۔ ان کے سوا اللہ تعالیٰ کو کسی اور نام سے یاد کرنا یا اسے اللہ کریم کا مقدس اسم سمجھنا جائز نہیں۔ فَلَهُ الاسماء الحسنیٰ کی تفسیر میں احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ ایسے ننانوے 99 نام ہیں۔ جن کی یاد انسان کو جنت تک پہنچا دیتی ہے۔ احادیثِ صحیحہ میں تو اسی قدر بیان ہوا ہے۔ مگر احادیث کے طبقہ ثانیہ کی کتابوں میں اور اسماءِ حسنیٰ کو بھی بزرگانِ دین نے فراہم کیا ہے اور لوگوں میں زیادہ تر مشہور روایت وہ ہے جو سنن ترمذی میں ہے اور اسی کے متعلق کتب میں یہ لکھا گیا ہے کہ ترمذی کے سوا اور کسی نے بھی تفصیل بیان نہیں کی۔

ان احادیث کی رُو سے جن میں تفصیل اسماء موجود ہے۔ تین طریقے ہیں جو محدثین میں مشہور ہیں۔ طریق اول ترمذی کا ہے اور اس بیان میں یہی سب سے زیادہ شہرت یافتہ ہے۔ اس طریق کو محدثین کی زبان میں طریق صفوان بن صالح کہتے ہیں اور اس طریق کو ترمذی علیہ الرحمۃ کے سوا طبرانی و ابن حبان و ابن خزیمہ نے بھی بیان فرمایا ہے۔

طریق دوئم زبیر بن محمد کا ہے جسکو ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ طریق سوئم عبد العزیز بن حصین کا ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے مگر ہر سہ طریق روایات اور اسمائے مبینہ پر غور کرنیکے بعد ایک محقق بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اسماءِ حسنیٰ کی تفصیل حضور اکرم محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت نہیں بلکہ علماء کرام نے اپنے اپنے فہم و علم سے ان اسماء کو قرآنِ پاک سے نکالا ہے اور حافظ ابن کثیر و حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہما نے یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ ابو زید لغوی نے اسماءِ حسنیٰ کا استخراج قرآن مجید سے کیا ہے۔ پھر اس فہرست میں امام سفیان بن عینیہ اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے ایزادی فرمائی ہے۔

اَسْمَاءُ اللّٰہِ الْحُسْنیٰ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے۔ اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّ تِسْعِیْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ یعنی اللہ کریم کے ننانوے نام ہیں۔ جو شخص انہیں بطور ذکر شمار کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔ ان اسمائے حسنیٰ میں سے "اللہ" اسمِ ذات ہے۔ باقی تمام نام صفاتی ہیں جن کی مجمل تشریح نقشہ ذیل کے آگے آئیگی۔

اَللّٰہ	الرحمٰن	الرحیم	الملک	القدوس	السلام	المومن	المھیمن	العزیز	الجبّار
المتکبر	الخالق	الباری	المصور	الغفار	القھار	الوھاب	الرزاق	الفتاح	العلیم
السمیع	البصیر	اللطیف	الخبیر	الحلیم	العظیم	الغفور	الشکور	العلی	الکبیر
الحفیظ	المقیت	الحسیب	الکریم	الرقیب	القریب	المجیب	الواسع	الحکیم	الودود
المجید	الشھید	الحق	الوکیل	القوی	المتین	الولی	الحمید	الحیّ	القیوم
الواحد	الاحد	الصمد	القادر	المقتدر	الاوّل	الآخر	الظاھر	الباطن	الوالی
المتعالی	البرّ	التواب	العفو	الرؤف	الجامع	الغنی	النور	الھادی	البدیع
ربّ	مبین	القدیر	الحافظ	الکفیل	الشاکر	الاکرم	الاعلیٰ	الخلاق	المولیٰ
النصیر	المقسط	الالٰہ	العلام	القاھر	الفاطر	الملیک	الحفیّ	المحیط	المستعان
الرفیع	الکافی	غالب	المنان	ذوالجلال	المحی	الممیت	الوارث	الباعث	الباقی

شمارہ	اسمائے حسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
١	اَللّٰہُ	معبوُد، خدا	اللہ کی ذات جامع الصفات حقیقتاً موجود اور ہر صفت کمال کے ساتھ موصوف ہے۔ عالم ہستی میں اس کے وجود کا انکار ناممکن ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عالمِ کائنات میں سوا اس کے کسی کا وجود اصلی اور حقیقی ہے ہی نہیں۔ یعنی وہی موجود اور سب معدوم ہیں۔ وہی ہست ہے اور سب نیست ہیں۔ وہی اصل ہے باقی سب سایہ ہیں۔ عالم کائنات میں اس کے سوا کوئی الوہیت رکھنے والا معبود نہیں۔ وہ معبودیت میں منفرد و یگانہ اور وحدت و تعدد سے پاک ہے۔ عظمتِ کمالیہ اسی کے لیے ہے۔ اس کی ازلیت بلا سبب، اور ابدیت بلا علت ہے اور وہ تمام صفات نقصان سے منزّہ ہے وہ آسمانوں اور زمینوں کا نوُر ہے۔ جس سے ہر چیز روشن ہوتی ہے۔ اللہ اسم عَلَم اور ذاتِ سبحان کے لیے خاص الخاص ہے جو کسی سے مشتق نہیں، اگر یہ بھی مشتق ہوتا تو اسمِ صفت ہوتا، جو موصوف نہ ہوسکتا۔ لفظ اللہ کی ترکیب لفظی پر ہی غور کیا جائے تو اس کی جامعیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ کا حرف اوّل ہمزہ یا الف نہ لکھا جائے تو لِلّٰہ پڑھا جائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز اللہ ہی کی ملکیّت ہے۔ پھر اگر لِلّٰہ سے پہلا لام بھی کم کر دیا جائے تو لَہٗ رہ جائے گا۔ جس کے معنی بھی وہی ہونگے کہ سب کچھ اسی کا ہے۔ یا اسی کے واسطے ہے۔ پھر لَہٗ سے بھی لام کم ہو جائے تو ہٗ رہ جائے گا۔ جس کا تلفظ ھُو ہے جو صرف واحدہ کر بھی اُسی کی ذاتِ وحید پر دلالت کرے گا

شمارہ	اسماء حسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی تعیین میں اسی اسمِ خاص کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر اسی اسمِ پاک میں عرفانِ تام ہوا تھا۔ انني انا اللّٰه۔
۲	الرحمٰن	بہت رحمت والا	رحمٰن کا اشتقاق رحمت سے ہے جو رحمت کی کثرت اور قوت پر دال اور دنیا و آخرت دونوں کی رحمت کو شامل ہے۔ رحمٰن کے لفظ میں رحمت بدرجہ اُتم موجود ہے۔ رحمٰن وہ ہے جو نوعِ انسانی کا محافظ ہر حال میں مدد فرمانے والا اور زمین و آسمان اور مافیہا کی صیانت مع ان کی خصوصیات طبعی کے کرنے والا ہے۔ رحمٰن کے معنی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ عالم اسی رحمت سے ہے۔ اور یہ اسمِ پاک سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا اور مولا کریم کے صفاتی اسماء سے مخلوق کے استعمال کے لیے سب سے مناسب اور موزوں اسم رحمٰن ہے۔ ہر چرند و پرند، درند سب پر رحمت کا منبع یہی ہے۔ سرکش اور جاہل انسان کی بداعمالیوں، فتنہ انگیزیوں اور افترا بندیوں کے باوجود رحمت رحمٰن نے اپنے دامنِ عاطفت کو تنگ نہیں فرمایا۔ اور کسی کو اس کے کفر اور شرک کے باعث اپنے آپ سے محروم نہیں رکھا اور فرماں برداری کی جزا افلاح دنیوی کے علاوہ عقیدت کیش اور توحید پرست انسانوں کو آخرت میں بھی عطا فرمانے کا وعدہ دیا گیا ہے جس کو یقیناً پورا فرمایا جائے گا۔
۳-	الرحیم	نہایت مہربان	رحیم رحم سے بنا ہے۔ رحم کا اطلاق عموماً عاجز، درماندہ، بے کس مصیبت رسیدہ پر ہوتا ہے۔ اس لیے رحیم وہ ہے جو ناچار مخلوق پر

شمارہ	اسمائے حسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			التفات کرنیوالا اور بگڑی بنانے والا ہو۔ کیونکہ اخلاق رذیلہ سے رہائی اور تباہ کن رذائل سے خلاصی تب ہی مل سکتی ہے جب رحم رحیم دستگیری فرمائے۔ پشیمان بندے کی التجا قبول فرمانا اور اس کی بداعمالیوں سے درگزر کرنا ازراہِ رحم ہی ہوتا ہے۔ رحم ہی غضبِ الٰہی سے نجات دلانے والا اور ٹوٹی ہوئی کو جوڑنے والا عمل ہے۔
۴	اَلْمَلِکُ	شہنشاہِ کُل	لُغت میں مَلِک بمعنی بادشاہ مستعمل ہوتا ہے۔ جس کو عام لوگ بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ مالک کے مقابلہ میں مَلِک بصورت مبالغہ ہے جو مملوکات کثیرہ کے مالک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی قطعۂ اراضی کا مالک تو ہو مگر اس پر حکمران نہ ہو۔ لیکن مَلِک کے لیے صفتِ حکمرانی کا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ وہ اس قطعہ پر حقوق مالکانہ نہ بھی رکھتا ہو اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی قوت کا راز اس جماعت کے قوتِ بازو میں مضمر ہوتا ہے جو اس کو اپنا بادشاہ سمجھتی ہے۔ لیکن اس مَلِک احکم الحاکمین کی حکومت و سطوت انسانی دست و بازو کی مرہونِ منت نہیں۔ اگر تمام دنیا کے انسان اس کی درگاہِ صمدیت میں انقیاد و طاعت گزاری کے طوق گردنوں میں ڈال کر سرِ نیاز خم کر دیں تو اس کی ازلی و ابدی شہنشاہیت میں ایک ذرّہ بھر کا اضافہ نہیں ہوتا۔ اور اگر سب اس سے سرکشی اختیار کر کے راندۂ درگاہ ہو جائیں تو اس کی حکومت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ دنیوی بادشاہوں کی طرح اس کی ذات انسانی طاعت گزاریوں کی محتاج نہیں۔

شمارہ	اسمائے حسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۵	اَلْقُدُّوْسُ	ہر نقص سے پاک	اسم قدوس قدس سے مشتق ہے۔ جس کے معنی انتہائی پاکیزگی کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی اور قدوسیت یہ ہے کہ نوری ملائکہ کی تقدیس میں اور رُوح القدس کی تقدیس میں بھی جو نقائص ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے بھی منزّہ و پاک ہے۔ یعنی روح اور ملائکہ کا مخلوق ہونا ان کی آغاز کی ابتدا، ان کے انجام کی انتہا ہی ایسے اوصاف ہیں جو ذاتِ سبحانی میں نقص سمجھے جاتے ہیں اور وہ ان سے بے عیب اور بالاتر ہے۔ وہ لوازم حدوث اور نقصان امکان سے ارفع و اعلےٰ دریافتِ حس اور تصورِ خیال اور احاطۂ عقل سے بلند تر ہے۔
۶	اَلسَّلَامُ	سلامتی میں کامل	سلام بطورِ اسم صرف اللہ تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ کی ذات کے لیے ہے۔ اس کے معنی سالم یا مکمل کے ہیں۔ یعنی وہ ذات جو خود سلامتی میں کامل اور مخلوق کو سلامتی بخشنے والی ہو اور جس کی سلامتی معرضِ خطر و زوال میں نہ ہو۔
۷	اَلْمُؤْمِنُ	ایمان و امن عطا فرمانے والا	یہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ پاک ہے۔ کیونکہ وہ ایمان عطا فرماتا اور امن بخشتا ہے۔ اس کا نام دل کو چین اور روح کو اطمینان دینے والا ہے۔ اس کا نام مومن اس لیے بھی ہے کہ وہ خود بھی اپنی ذاتِ پاک کی شہادت ادا فرماتا ہے۔ دوسرے معنوں میں امن سے بنا ہے۔ جس کے متعلق قرآن پاک میں ہے کہ اگر تم کو علم ہے تو بتلاؤ ہر دو میں سے کون زیادہ امن کا حقدار ہے۔ یعنی مولا کریم یا مشرکوں کے بُت اور خلافتِ راشدہ کی علامات سے قیامِ امن کا ذکر فرمایا کہ ہم ان کے خوف کو امن سے بدل دیں گے۔

شمارہ	اسمائے حسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۸	اَلْمُهَيْمِنُ	غیر کے خوف سے نگہبانی کرنے والا	یہ اسم محافظت اور پناہ میں لیے جانے کے معنوں میں آتا ہے جو دوسرے کے خوف سے مامون بنا دے۔ اور اسماء الحسنیٰ میں اسم سلام و مومن کی تاثیرات کا جامع ہے۔ اہلِ کلام نے اس کے معنی شاہد اور امین کے بھی لکھے ہیں۔ جو اس سے مخلوق کے اعمال کا نگران مراد لیتے ہیں اور وہ امین بھی جو کسی کا حق ضائع نہ کرے۔ مہیمن اصل میں کسی چیز کو زیرِ سایہ لینے کو کہتے ہیں۔ جیسے پرندہ بچے کو پروں کو نیچے چھپا لیتا ہے۔ اسی سے نگہبانی کے محاورہ میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔
۹	اَلْعَزِيْزُ	حقیقی عزت و غلبہ والا	یہ اسم عزّت سے مشتق ہے اور عزت کے معنی غلبہ، دبدبہ اور بے پناہ قوت و ارجمندی کے ہیں۔ یعنی عزیز وہ ہے جس سے سب کو احتیاج ہو۔ اور مثل نایاب۔ ایسی عزت کے جمیع اقسام اللہ تعالےٰ ہی کے قبضہ میں ہیں جو انتہائی عزّت کا مالک ہے۔ قرآنِ کریم میں اسم عزیز کو دوسرے اسماء کے ساتھ بھی اسی مفہوم میں ذکر کیا گیا ہے چنانچہ ۴۲ مقام پر عزیز حکیم اور ۵ مقام پر عزیز رحیم اور ۲ مقام پر عزیز غفور اور ۳ مقام پر عزیز غفار اور ایک جگہ پر عزیز مقتدر اور ۲ مقام پر قوی عزیز اور ایک جگہ عزیز وہاب اور ۴ مقام پر عزیز العلیم اور ۲ مقام پر عزیز الحمید ارشاد ہوا ہے ان اسماء الحسنیٰ پر غور کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ذات جسکو ساری مخلوق پر کامل غلبہ اور پورا اقتدار ہو وہی سب سے عزیز کہلانے کی مستحق ہے۔
۱۰	اَلْجَبَّارُ	بڑے دباؤ اور اصلاح کا مالک	جبر کے معنی درستگی کے ہیں، یعنی جبار وہ ذات ہے جو نقصان اور کمزوری کی تلافی کرے اور شکستہ اعضاء کو جوڑے۔ اللہ تعالیٰ کا اسمِ پاک انہی معنوں میں ہے۔ کہ وہ

شمارہ	اسماء حسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			ہڈیوں میں پیوستگی شکستہ قلوب کو ڈھارس دیتا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جبّار کی حقیقت یہ ہے کہ اس تک کسی طرح بھی رسائی نہ ہو اور وہ عقل و فکر کی رسائی سے بھی بالاتر ہو۔
۱۱	اَلْمُتَکَبِّرُ	کبریائی اور عظمت و شرف کا مالک	کبر کے معنیٰ رفعت و شرف کے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو حقیقتاً عظمت و علوّ شان کی مالک ہے۔ متکبّر چونکہ اسماء الحسنیٰ میں داخل ہے۔ اس لیے اس کے صحیح معنیٰ یہ ہوں گے کہ وہ معبود جو اپنے علو و برتری میں سب سے بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ ہو اور ہر چھوٹے کو شانِ علوّ عطا فرما سکے۔ اور ہر مدِ مقابل اپنی کبریائی میں اس سے حقیر و ذلیل ہو۔
۱۲	اَلْخَالِقُ	ہر چیز کا نیست سے ہست کرنے یا پیدا فرمانے والا۔	خلق کے معنیٰ تقدیر و اندازہ کے ہیں۔ گویا خالق وہ ذات ہے جس نے ماہیات کا اندازہ اور ذوات کا تعین فرمایا۔ یا جو حقائق کو عدم سے وجود میں لایا۔ یہ لفظ قرآنِ کریم میں خالق، خلّاق اور احسن الخالقین تین طرح مستعمل ہوا ہے۔ اگرچہ ہر ایک صفت خلق سے ہی متعلق ہے گویا اللہ تعالیٰ خالق بھی، خلّاق بھی اور احسن الخالقین بھی ہے لیکن محلِ استعمال میں ہر جگہ جداگانہ کیفیت و خصوصیت پائی جاتی ہے۔ بعض حضرات کی تحقیق میں اسم خالق ایجاد کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
۱۳	اَلْبَارِئُ	ہر چیز کو عدم سے وجود میں لانے والا اور عیوب سے بری۔	یہ اسمِ مبارک پیدائش اور ایجاد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور بالخصوص خلقِ حیوانات کے لیے زیادہ مستعمل ہوا ہے۔ عدم سے وجود میں لانے اور عیوب سے بری کرنے، بیماریوں سے شفاء

شمارہ	اسماءالحسنیٰ	ترجمہ	مختصر شرح
			بخشنے میں بھی آیا ہے۔
۱۴	اَلْمُصَوِّرُ	صورت گر یعنی ہر ایک کو اپنی اپنی صورت بخشنے والا۔	یہ اسم اللہ تعالیٰ کی اس صفتِ صورت گری پر دلالت کرتا ہے جس سے سب کو اپنی اپنی شکل و صورت میں انفرادی اور امتیازی شان بخشی جاتی ہے۔ دنیا میں جو انسان مصوّر کہلاتے ہیں وہ صورت بنانے والے نہیں ہوتے بلکہ صورت کی نقل کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور نقل بھی اصل کے برابر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ تصویر کے معنی صورت کی نقل اتارنا ہے۔ صورت بخشنا نہیں ہے تو المُصَوِّرُ کے معنے رب العزّت کی شان میں مخلوقات کو صورتیں عطا فرمانے والا ہوں گے۔
۱۵	اَلْغَفَّارُ	ڈھانپنے والا	یہ مغفرت کے مصدر سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جو چھپانے ڈھانپنے اور بخشنے کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اسی مصدر سے غفور، غافر اور غفار بھی قرآن پاک میں آیا ہے۔ مغفر (کلاہ آہنی) اور غفیرہ (زرہ آہنی) وغیرہ اسی سے ماخوذ ہیں۔ اللہ کریم کا یہ اسم پاک اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں کو چھپا دیتے ہیں۔
۱۶	اَلْقَهَّارُ	کامل غلبہ رکھنے والا	قہار وہ ہے جو ہر ایک غالب سے غالب تر ہو۔ اس اسم الٰہی میں نرالی شان اور جلالی آن پائی جاتی ہے۔ یہ الوہیت اور وحدانیت کے سوا اور کسی اسم کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ یہی اسم بتلاتا ہے کہ وجود کو اعیان پر اور واجب الوجود کو امکان پر کس طرح غلبۂ تام حاصل ہے۔ کوئی شے، کوئی امر، کوئی زمان، کوئی مکان اسکے غلبۂ سے باہر نہیں

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۱۷	اَلوَھَّابُ	بے منت اور بے انتہا عطا فرمانے والا	یہ اسم کثرتِ ہبہ اور مداومتِ عطا پر دلالت کرتا ہے اور ہبہ کی حقیقت وہ عطیہ ہے جو بلا کسی غرض و امید اور بغیر کسی عوض کے ہو۔ لہٰذا وہاب وہ ذات ہوئی جس کے عطاہائے صوری و معنوی اور عطیاتِ دنیوی و اخروی کی کوئی حد نہ ہو۔ اور جو بغیر حیلہ اور بغیر سوال کے عطا فرمائے۔
۱۸	اَلرَّزَّاقُ	رزق پہنچانے والا	یہ اسم رزق سے مشتق ہے اور وہ سب اشیاء جن سے انسان حسّی و ذہنی طور پر نفع حاصل کرتا ہے۔ رزق میں شامل ہیں بعض اہل اللہ نے رزق کو دو قسموں ایک روحانی دوسرا جسمانی میں بیان فرمایا ہے۔ جس سے ذاتِ رزّاق کا پتہ چلتا ہے۔ کہ وہی ذات جسموں کو توفیق کی غذا اور روحوں کو تصدیق کی نعمت عطا فرمانے والی ہے۔
۱۹	اَلفَتَّاحُ	مشکل کشا	یہ اسم فتح سے ماخوذ ہے۔ اور فتح کے معنی لغت میں کشائش اور کشودگی کے ہیں۔ گویا فتاح وہ ذات ہے جو مشکلات و مہمات کو کھولتی، زبانوں پر علوم کو جاری فرماتی، آنکھوں کے پردے اٹھاتی اہلِ حق و باطل کے درمیان فیصلے کرتی، صادقین کے صدق اور کاذبین کے کذب کی اصلیت کو واضح فرما دیتی ہے۔ اور نیکی و بہبودی کی تمام قسموں، ابتدا اور انتہا کی حقیقتوں، اندرونی اور بیرونی رازوں میں سے سب کچھ کا انکشاف وا فتتاح اسی سے متعلق ہے۔
۲۰	اَلعَلِیمُ	علم والا اور	یہ اسم اللہ تعالیٰ کے مشہور اسماء سے ہے اور علم سے

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
		علم بخشنے والا	مشتق ہے۔ پچیس ۲۵ آیاتِ قرآنیہ میں یہ اسم مذکور ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کی اور سینہ کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اس کو اعمالِ انسانی کا ایسا علم ہے کہ وہ انسان کی دل اور آنکھ کی ہر خیانت سے واقف ہے۔ زمین کے اندرونی راز، آسمانوں کے اسرار، نیچے سے اوپر کو اُٹھنے والی چیزیں اور اوپر سے نیچے نازل ہونے والی اشیاء، ذرّہ ذرّہ، قطرہ قطرہ کا اس کو علم ہے۔ بلکہ اس سے بھی کمتر جسامت کی کوئی شے اس کے علم سے باہر نہیں۔ گزری ہوئی امتیں اور آنے والی نسلیں سب اس کے علم میں ہیں۔ وہ مخلوق کی ہر حالت کو جانتا ہے۔ اس کو علم ہے کہ ہر مادہ کے پیٹ میں کیا ہے اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔
۲۱	اَلسَّمِیْعُ	جملہ اصوات و مسموعات کا سننے والا	سمیع وہی ہے جو جملہ اقوال والفاظ اور کلمات وعبادات کا سننے والا ہے اور ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے۔ مخلوق کی سماعت کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ سماعت سے کوئی نسبت نہیں۔ کیونکہ اس کی سماعت کی حقیقت یہ ہے کہ انگنت اصوات، کروڑوں لغات، لاکھوں معروضات اس کی سماعت میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔
۲۲	اَلْبَصِیْرُ	ہر متعلق دید کو دیکھنے والا	یہ اسم بصر سے مشتق ہے اور بصر اس قوت کو کہتے ہیں۔ جو مشہودات کا ادراک کرتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ہر حال میں اور ان کے اعمال کو وہ پوشیدہ ہوں یا ظاہر اور

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			ہر شے کے الوان و اجسام و ہیئت و اشکال کو دیکھنے والا ہے۔ الصار کو اس کا ادراک نہیں، اور اُسے ابصار کا ادراک حاصل ہے۔ وہ سب کی بصر کا مالک ہے اور وہ بصیر وہ ہے جس نے کان کی ہڈی کو سُننا اور آنکھ کے پردوں کو دیکھنا سکھایا ہے۔ دلوں کی حالتیں اور طبائع کے اطوار سب اسکی نظر کے سامنے ہیں۔
۲۳	اَللَّطِیْفُ	نہایت لطف والا	لطیف وہ ذات ہے جسکی ہر بات میں غایت درجہ عنایت و مہربانی ہو اور وہ اپنی انتہائی لطافت کے باعث محسوس نہ ہو سکے اور باریک سے باریک امور کی عالم ہے۔ اللہ تعالےٰ اس لیے لطیف ہے کہ اس کا لطف تکوینی موجودات کو فیضان وجود عطا فرماتا ہے اور عدم سے ہستی بخشتا ہے اور اسی سے معنوی اشیاء مجردہ، عقول و نفوس اور ملائکہ و انبیاءؑ علیہم السّلام کے باطن کی تربیت ہوتی ہے۔ لطیف کے معنیٰ دانائے امور مخفیہ اور واقف دقائق عجیبہ بھی ہیں۔
۲۴	اَلْخَبِیْرُ	آگاہ و خبردار	خبیر خبر سے بنا ہے، جس کے معنے ساری مخلوق کی خبر رکھنے والے اور خبر بتلانے والے کے ہیں۔ یعنی مولا کریم تمام کائنات کی ہر حالت و کیفیت سے پورا پورا خبردار ہے اور ہر چیز کی کُنہ پر مطلع ہے۔ جملہ اخبار غیب و شہادت پر مطلع ہونا اور جمیع وقائع سے خبرداری اس کی صفت ہے۔
۲۵	اَلْحَلِیْمُ	بڑا بردبار اور بڑے حوصلہ کا مالک	حلیم وہ ذات ہے کہ تغیراتِ اعتباریہ اس کی ذات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اور غضب اس کی رحمت پر غالب نہیں

مختصر تشریح	ترجمہ	اسماء الحسنیٰ	شمارہ
آسکتا اور باوجود گناہ وجرم دیکھنے اور قوتِ انتقام رکھنے کے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتی اور رحمت اس کی صفت غضب کیلیے مانع بھی نہیں ہوسکتی۔			
اسم عظیم عظمت سے مشتق ہے۔جس کے معنی انتہائی بڑائی کے ہیں اور وہ صرف مولا کریم ذات وحدہٗ کے لیے ہے کیونکہ وہی ربِّ عرشِ عظیم، مالکِ فضلِ عظیم، عطا کنندۂ ملکِ عظیم، منزلِ قرآنِ عظیم بخشندۂ فوزِ عظیم اور ہر عظمت وکبریائی وجبروت و ملکوت کا مالک ہے اور اسے ہی عظمتِ حقیقی وذاتی حاصل ہے۔ اس کی عظمت کے سامنے ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق بھی کمتر ہے۔	بڑی عظمت والا	اَلْعَظِیْمُ	۲۶
غفران سے بطور صیغہ مبالغہ مستعمل ہے۔ اور اس ذات کے لیے خاص ہے۔جس کی عطا وبخشائش بے انتہا ہو غفور کے علاوہ غفار اور غافر بھی آیا ہے۔جس کے معنی ہیں محشر میں گناہوں کا پردہ پوش اور غفار وہ جو بندوں کے گناہوں کو ملائکہ کی بھی آنکھ سے پوشیدہ کردے۔	بہت بخشش والا	اَلْغَفُوْرُ	۲۷
یہ اسم شکر سے ماخوذ ہے۔جس کے معنی کسی کام کا قبول کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ شکور ہے کہ وہ بندوں کی عبادات و طاعات اور اعمال صالحہ کو قبول فرماتا ہے۔ اوران کو توفیق شکر بھی دیتا ہے۔بعض صوفیا نے شکر کے معنے حمد و ثنا بیان کرنا بھی لکھے ہیں۔ امام حجۃ الاسلام فرماتے ہیں کہ شکور	سعی کے قبول کرنے اور خدمت سے راضی ہونیوالا	اَلشَّکُوْرُ	۲۸

شمارہ	اسمار الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			وہ ذات ہے جو تھوڑی سی اطاعت کے عوض میں اجر زیادہ دے اور تھوڑی عمر کے اعمال کا بدلہ ابدی نعمتیں بخشے۔
۲۹	اَلْعَلِیُّ	انتہائی بلندی کا مالک	علی علّو سے ہے۔ جس کا مطلب سب سے بلند و بالا اور سب سے غالب و توانا ہے اور اس کے مقابلے میں سب مراتب پست ہوتے ہیں۔ وہ جملہ علویات سے بالاتر اور بندوں کے لیے برتر تعریف کو دنیا میں قائم فرماتا ہے۔ اس کا ہر کام، ہر نام، ہر شان، ہر حکم بلند ہوتا ہے۔
۳۰	اَلْکَبِیْرُ	بےحد بڑائی والا	حقیقت میں کبیر اس کو کہا جاتا ہے جسکو جملہ موجودات پر سبقت حاصل ہو۔ اور اسکی کبریائی کے سامنے ہر کبیر بھی صغیر ہو۔ وہ اپنی کبریائی سے عام بندوں پر فضل کبیر مخلصین کو فوز کبیر، اہلِ طاعت کو اجر کبیر اور اہلِ ایمانِ کامل کو ملک کبیر سے شاد کام فرمائے۔
۳۱	اَلْحَفِیْظُ	کامل حفاظت فرمانے والا	حفظ کے معنی ہیں نگاہ رکھنا اور حفیظ حافظ کا مبالغہ ہے رب العزّت کی ذات ساری کائنات کی محافظ اور موجودات کی حفاظت فرمانے والی ہے۔ جس سے ماندگی، تھکاوٹ اور سستی کا اس پر کوئی اثر نہیں اور اس صیانت میں اس کو کچھ دشواری بھی نہیں ہوتی۔ قوامِ عالم اسی سے ہے اور نظامِ اعظم کا وہی ناظم ہے۔
۳۲	اَلْمُقِیْتُ	نگہبان و عطائے قوت میں مستحکم	قُوت سے ہے۔ قوّت غذا کی وہ مقدار ہوتی ہے۔ جو جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ اور قوت عطا کرنے میں توانائی رکھنے والے کو مُقیت کہا جاتا ہے۔ گویا مُقیت وہ ہے کہ نباتات جمادات، حیوانات، جن و ملک اپنی اپنی طبعی ساخت اور

مختصر تشریح	ترجمہ	اسماء الحسنیٰ	شمارہ
اقتضائے فطرت کے مطابق اس کی روزی سے پل رہے ہیں۔			
حسیب حسب سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنے محاورہ میں کفایت کنندہ کے ہیں۔ مہمات امور میں چونکہ مولا کریم ہی ہر طرح کافی ہیں اس لیے حسیب کے اسم مبارک سے ہر بات میں پکارے جاتے ہیں۔ حضور علیہ السّلام کو ارشاد ہوتا ہے کہ کہدو اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اعدا کی منصوبہ بندیوں کے مقابلہ میں اور خوف کی تمام حالتوں میں اسی کی کفایت کام کرتی ہے حسیب کے معنی حساب کنندہ کے بھی آئے ہیں، جیسے ارشاد ہے، سورج اور چاند حساب کے اندر ہیں۔	کفایت کرنے والا	اَلْحَسِیْبُ	۴۳
کریم کرم سے ہے اور کرم کے معنی جود وسخا اور انتہائی عزت وعظمت کے ہیں۔ اہلِ زبان کے محاورہ میں صفتِ کریم پر یوں اطلاق ہوتا ہے کہ وعدہ میں وفا، باوجود قدرت وطاقت کے عفو، عیب دیکھنے پر بھی پردہ پوشی اور گناہ معلوم ہونے پر درگزر کرنا، اللہ تعالیٰ کریم ہے اور جملہ معانی کے اعتبار سے کریم ہے۔ رسولِ کریم علیہ السّلام کا مبعوث فرمانا، قرآنِ کریم کا نزول اجرِ کریم کا عطا کیا جانا، مدخل کریم کا داخلہ، رزقِ کریم کی ارزانی، تمام تر مخلوق پر نوال وکرم کی بارش، اس کی شانِ کریمی میں داخل ہے۔ وہی حقیقتاً مالکِ جود وکرم، جوادِ مطلق اور غنیٔ برحق ہے۔ جو امید سے زیادہ عطا فرما کر ہر امیدوار کو سرفرازی بخشتا ہے۔	کرامتِ حقیقی کا مالک	اَلْکَرِیْمُ	۴۴

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۳۵	اَلرَّقِیْبُ	ہمیشہ حفاظت میں رکھنے اور نگرانی کرنیوالا	رقیب کے معنوں میں علم اور حفظ کی مجموعی صفت جمع ہوتی ہے اور صلحاء نے لکھا ہے کہ رقوب کے معنے کسی چیز کو ہمیشہ محفوظ اور زیر نظر رکھنے کے ہیں۔ اور وہ مولا کریم ہی ہے جو موجودات کی حفاظت اور معلومات کی رقابت فرماتا ہے۔ گویا ہر شے کا نگران و نگہبان وہی ہے۔
۳۶	اَلْقَرِیْبُ	ہر طرح نزدیک	قُرب کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شے یا انسان کے احوال پر ہمارا علم، ہماری شنوائی، ہماری بینائی، بیک وقت و بیک لحظہ کام کرتی ہوں، جس سے ثابت ہو کہ وہ شے یا انسان ہم سے قریب ہے۔ یا ہم اس سے قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے ایسا قریب ہے جس کی مثال نہیں۔ گو وہی قرب ہم کو اس سے حاصل نہ ہو مگر عبادت الٰہی حظِّ وافر تعقل کامل، یقین واثق اور اعتمادِ محکم سے مشغول رہنے والے بندوں سے رحمتِ الٰہی قریب تر ہوتی ہے۔ یہ پاک ذاتِ خدا کے متعلق عرفان ہے کہ وہ ہم سے قریب ہے اور ہماری باتوں، التجاؤں اور دعاؤں کو سنتا ہے۔ حضور علیہ السّلام کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ۔ تحقیق میرا رب قریب ہے اور میری دعا سنتا ہے، ظاہر ہوئے ہیں۔ جو ایسے ہی قرب کو بتاتے ہیں جو انبیاء علیہم السّلام کو بوجہ قبولیت و شرف اور اختصاص خاص حاصل ہوتا ہے۔

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۳۷	اَلْمُجِیْبُ	جواب اور اجابت کا مالک	اسم مجیب، جواب اور اجابت سے ماخوذ ہے۔ اجابت کے معنی جواب دینے اور دعا قبول کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا اور شرفِ اجابت بخشتا ہے۔
۳۸	اَلْوَاسِعُ	نامتناہی فراخی رکھنے والا	اسم واسع میں رب العزت کی جود و عطا جبطۂ اندازہ سے باہر ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس نے جملہ اشیاء کو اپنی وسعت میں گھیر رکھا ہے۔ اور اسکی رحمت سب کو شامل اور اس کا علم ہر شے پر حاوی ہے۔ جس کی کوئی حد و انتہاء نہیں ہے۔
۳۹	اَلْحَکِیْمُ	صاحبِ حکمتِ کُلیہ	یہ اسم حکمت سے مشتق ہے۔ اور جو مصالح کلیہ نظامِ عالم کا قوام ہیں ان کا نام حکمت ہے۔ بعض علماء صوفیہ نے لکھا ہے کہ افضل العلوم سے افضل الاشیاء کو معلوم کرنا حکمت کہلاتا اور احسن اخلاق اور احسن اعمال کا حکمت ہونا بھی بیان کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں حکمت کو خیرِ کثیر بھی فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور وہ حکمت والے کلام کا نازل کنندہ ہے۔ شرائعِ الٰہیہ اور احکامِ ربانیہ کی تحقیق دفترِ تکوین کا مطالعہ صحیفۂ فطرت کا ملاحظہ، رب العٰلمین کی حکمت کو نمایاں تر فرما دیتا ہے۔ کیونکہ خالق الکل کے تمام احکام و افعال حقیقتاً صحیح ترین مقصد، نفع بخش فوائد اور احسن ترین اطوار پر مبنی ہیں۔ لہٰذا الحکیم کا اسم اسی کی ذاتِ پاک پر صادق آتا ہے جس حکیم مطلق کی حکمت ماہیاتِ اشیاء پر محیط ہے۔

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۴۰	اَلْوَدُوْدُ	نیکی کرنیوالوں کا دوست	اس کے معنے اُس صفائی محبت کے ہیں جس میں شائبۂ اغراض نہیں ہوتا، بلکہ محض خلوص ہی خلوص پایا جاتا ہے۔ بعض نے وَدُوْد سے مَوْدُوْد بھی مراد لیا ہے۔ یعنی وہ ہستی جس سے شدید محبت کا تعلق پیدا کیا جائے۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ اس کا ترجمہ حبیب بھی کرتے ہیں۔ اسی مفہوم پر کمالِ محبت اور پیار کرنے والا بھی وَدُوْد کا معنیٰ کیا گیا ہے۔ محبت کی تعریف میں بزرگانِ دین نے لکھا ہے کہ ایک محبوب پر تمام محبوبات کی قربانی، حاضر و غائب میں محبوب کی موافقت، دعویٰ کی نفی، ترکِ آرام، صدق طلب، خلوصِ ارادت جان نثاری، جفا و عطا کا عدم تاثر محبت کہلاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ محبت یہ ہے کہ زبان پر شکوہ، دل میں اعتراض اور آنکھ میں نقص نہ آئے۔ بلکہ محبوب کی مار میں لذت حاصل ہو اور اس کی طرف سے ذلت عزت سے زیادہ محبوب ہو اور حضرت علامہ وحید الدین فرماتے ہیں محبت وہ ہے جہاں عزت و ذلت کا احساس ہی نہ رہے۔
۴۱	اَلْمَجِیْدُ	بلند پایہ شرف کا مالک	مجید مجد سے ماخوذ ہے اور مجد بلند پائیگی، شرف واسع اور عالی مرتبگی کا مجموعہ ہے۔ یہ اسم اللہ تعالیٰ، قرآنِ مجید اور عرشِ اعظم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور بلاشبہ جو علو مرتبت اور وسعتِ شرافت ان میں پائی جاتی ہے وہ دنیا و مافیہا کی بلند پائیگی سے حقیقتاً علیحدہ ہے۔
۴۲	اَلشَّهِیْدُ	ظاہر و باطن پر مطلع	شہید اللہ کریم کا اسمِ پاک ہے جو گواہی، آگاہی، خبر قاطع

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			اور خدا کی راہ میں جان دینے پر مستعمل ہوا ہے۔ بعض مقامات پر شہید بمعنی حاضر و ناظر بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لیے شہید ہے کہ کائنات کی کوئی شے، کوئی سکون، کوئی حرکت اس کی شہادت سے باہر نہیں، شہید عام اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو چشمدید حالات بیان کرے۔
۴۳	اَلْحَقُّ	سچائی کے ساتھ برقرار رہنے والی ذات	لغت میں حق کے معنی راستی، راستبازی، حصہ معین عمل لازم الوقوع، عدل و انصاف، کمال و اتمام، صداقت، اصلیت اور رشد و ہدایت کے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اسم پاک اپنے ان جملہ معانی کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ کیونکہ وہ دین الحق دعوت الی الحق، بشارت حقہ، کتاب حق اور حق کے ساتھ فیصلے فرمانے کا مالک ہے۔ حق کو نازل فرمانا اور رسولِ حق بھیجنا، حق بتانا اور حق دکھلانا اسی کی صفت ہے۔ حقانیت اسی کی ہی ذاتِ مقدس کو حاصل ہے۔ اور اسی سے نورِ حقانیت جلوہ ریز ہوتا ہے۔ پھر جس کو اس سے نسبتِ صحیحہ حاصل ہو۔
۴۴	اَلْوَکِیْلُ	کارساز	یہ اسم وکل سے ہے۔ جس کے معنے کسی کام سے تھک کر رہ جانے، اپنا کام دوسرے کے سپرد کرتے اور خود سرانجام دینے سے عاجز کے ہیں، جب انسان کسی دوسرے پر اعتماد و وثوق کر لیتا ہے، تو اسے وکیل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اسی لیے وکیل کہی جاتی ہے کہ جملہ امور میں درستی و اصلاح، انتظامِ عالم کی اعتمادی حیثیت، عاجز نوازی، بندہ پروری، موجودات کے

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			جملہ امور کا سرانجام دینا۔ اور زمامِ اختیاراتِ کلیہ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔
۴۵	اَلْقَوِیُّ	قوتِ کاملہ رکھنے والا	یہ اسم قوّت سے ماخوذ ہے۔ جس سے مراد ہر وہ طاقت ہے جو ظاہری و باطنی طور پر پورا غلبہ رکھے، اور اس کے ہوتے ہوئے مشقّت و کلفت کا احساس نہ ہو اور استقلال و عمل دوام کے ساتھ پائی جائے۔ مفسرین نے قوّت کی تفسیر آلاتِ حرب بھی کی ہے۔ حضرت عتبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور علیہ السّلام نے ایک خطبہ میں برسرِ منبر قوّت کی تشریح تیر انگلی فرمائی تھی۔ اللہ کریم تمام قوتوں کا مالک ہے اور اسی نے جملہ مظاہر کو قوتِ حقیقی سے ظہور بخشا ہے۔ دل کو قوّتِ ایمان، روح کو قوتِ عرفان بخشنا اسی کی قوتِ کاملہ کا کام ہے۔
۴۶	اَلْمَتِیْنُ	شدید القوت	متین وہ ذات ہے جو پوری طاقت پر استقامت رکھے کلفت سے مبرّا، ان تھک اور لامحدود قوت رکھنے پر قادر مستقل بالذات اور کسی دوسری طاقت کی محتاج نہ ہو۔
۴۷	اَلْوَلِیُّ	یاور و مددگار	یہ وَلا سے ماخوذ ہے اور وَلا کے معنے قرابت، دوستی مددگاری اور مِلک کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو اسی لیے ولی فرمایا ہے کہ وہ مومنوں کا محبّ، ایمانداروں کا دوست، متقیوں کا ولی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السّلام اپنی دعا میں عرض کرتے ہیں۔ اے رب العزت دنیا میں تو ہی میرا

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			رب اور آخرت میں تو ہی میرا ولی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی محبت اور صداقت حاصل کرنے سے اللہ کے ان بندوں کو بھی اولیاء اللہ کا خطاب مل جاتا ہے جو ایمان و تقویٰ میں برگزیدگی اور بلند درجہ رکھتے ہیں۔
۴۸	اَلْحَمِیْدُ	مستحقِ حمد و ثناءُ	حمد سے مشتق ہے اور لفظ حمد جملہ صفاتِ جمالیہ کا جامع ہر وصفِ قدرت، حکومت، الہیت و عظمت پر حاوی ہے۔ اس کے مترادف دو لفظ مدح اور شکر بھی ہیں۔ مدح ہر چیز کی تعریف میں بولا جاتا ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ وہ صفت ممدوح میں پائی بھی جائے اور شکر مدح سے خاصکر ذوی العقول کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ غیر ذوی العقول کے لیے نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ مدح کا استعمال عطاء نعمت سے قبل اور شکر کا استعمال عطاء نعمت سے بعد ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کو حمد کا مالک اور اسی کی تفصیل میں الوہیت، متانت، منّت، جلال و اکرام کا ذکرِ خیر بھی فرمایا ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کا حمید یعنی مالک الحمد ہونا ثابت ہوتا ہے۔
۴۹	اَلْحَیُّ	زندہ، اور زندہ کرنے والا	یہ اسمِ مبارک حیات سے ماخوذ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کا نام حیّ اس لیے ہے کہ وہ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ ہے۔ باقی سب قابلِ فنا ہیں۔ وہی لوازمِ حیات، علم و قدرت، سمع و بصر اور ارادت و کلام والا ہے۔ اور وہی حیاتِ ذاتیہ کا مالک ہے۔ دائم بلا زوال نہ کبھی عدم اس کے سابق حال ہوا

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			اور نہ کبھی موت اس کو لاحق ہوگی۔
۵۰	اَلْقَیُّوْمُ	قائم بالذات	قیّوم مبالغہ ہے قیم کا جس کے معنی ہیں مصلح امور اور بذاتہٖ قائم جس کی حیات دوسرے کی محتاج اور اس کا قیام کسی دوسری شے پر منحصر نہ ہو۔ وہ قائم، دائم، موجود و لازوال اور غیر متغیر ہو القیوم کے معنے مجاہد رضی اللہ عنہ نے ہر چیز پر قائم بتلائے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ باقی علی الابد، ہمیشہ سے موجود اور ہمیشہ سے صفتِ حیات سے موصوف ہے۔
۵۱	اَلْوَاحِدُ	یگانہ	واحد وہ ذات ہے جو سلسلۂ اعداد و شمار میں نہ آسکے اور ہر قسم کی دوئی سے منزہ ہو۔ مخلوق میں سے کسی کو بھی ایسی وحدت حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدت اس کا الوہیت میں منفرد ہونا اور شرکتِ غیر سے پاک تر ہونا ہے۔ یہی ایک اسم ہے جو تمام کائنات سے اسکو یکتا اور بے مثل کرتا ہے۔ گویا لا الٰہ الا اللہ کی حقیقی تفسیر اور اس کے عرفان کی دلیل بھی یہی ہے۔
۵۲	اَلْاَحَدُ	یکتا	معنے کے لحاظ سے واحد اور احد ایک ہی سمجھے جاتے ہیں، کیونکہ دونوں اسماء توحیدِ خالص پر دال ہیں۔ واحد وہ ہے جس کا تجزیہ نہیں ہوسکتا۔ اور احد وہ ہے جس کی نظیر کوئی نہ ہو بعض علماء نے اس کے معنی ایسا ایک جس کا کوئی شریک نہ ہو اور وہ ایک جس سے پہلے کوئی نہ ہو، کہے ہیں۔ جو مولا کریم کی یکتائی و بے ہمتائی پر دلالت کرتے ہیں۔
۵۳	اَلصَّمَدُ	بے نیاز	صمد کے لغوی معنے بے احتیاج، بے جوت، بے احشا

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			اور جس سے کوئی چیز خارج نہ ہو، کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں صمد کے معنی بے زوال، بے پرواہ، سیادت میں کامل عظمت و حکمت میں اکمل، اپنی ہستی میں مجتمع اور قوی، مرجع حاجات اور منتہائے کمالات بیان ہوا ہے۔
۵۴	اَلْقَادِرُ	قدرت والا	قادر، قَدر بمعنی اندازہ اور قدرت بمعنی توانائی دونوں میں مستعمل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کی ایک خاص مقدار رکھی ہے۔ اور ہر چیز کو اندازہ کے موافق پیدا فرمایا ہے۔ کوئی انسان نہ اس کی قدرت کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ اس کے علم قدر کو سمجھ سکتا ہے اور وہ بے پناہ قدرت والا اور تمام مخلوق پر قدیر و قادر ہے۔
۵۵	اَلْمُقْتَدِرُ	اقتدار کلی کا مالک	اسم قادر کے مقابلہ میں المقتدر مبالغہ میں ہے۔ قادر کا استعمال خلق، پیدائش، احیاء، قدر کے افعال پر ہوا ہے اور مقتدر، عزت، غلبہ، فرمانروائی کی شانِ کامل میں یعنی رب العزت جلّ و علا شانہٗ، کو وہ قدرتِ تامہ و کاملہ حاصل ہے جس کی مثال نہیں۔
۵۶	اَلْاَوَّلُ	سب سے پہلے	وہ ذات جس کی ہستی کا آغاز نہیں اور اس کو جملہ موجودات پر تقدم حاصل ہے۔ ہدایات کی ابتداء اسی کی اولیّت سے اور ماسوا کا ترتّب اسی کی وجہ سے ہے اور ہر شئے کا مرجع وہی ہے
۵۷	اَلْاٰخِرُ	سب سے بعد	ذاتِ باری تعالیٰ کا کوئی آخیر نہیں، وہ ازلی ابدی ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جس قدر اواخر اعتباری ہیں ان سب کے بعد اسی کا قیام ہے۔ گویا مخلوقات کی فنا کے بعد

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			اسی کی بقا کو آخرویت حاصل ہے۔ اور ہر نہایت کی انتہا اسی کے تاخّر کے تحت میں ہے۔
۵۸	اَلظَّاهِرُ	بے شبہ ظہور کا مالک	ظاہر کا اصل ظہیر ہے اور ظہیر پُشت کو کہتے ہیں۔ گویا وہ چیز جو ادراکِ حس میں آجائے جس کو انسان اپنی معرفت بدیہہ سے پا سکے اور ہر ایک موجود شے اس کی ہستی پر دلیل فطرتِ انسانی بن سکے۔
۵۹	اَلْبَاطِنُ	مخفی از حس	بطن شکم کو کہتے ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی رازداری کے ہیں جیسے قرآن پاک میں آتا ہے، ولا تتخذوا بطانۃ من دونکم یعنی اہلِ ایمان کے سوا دوسروں کو اندرونی معاملات کا رازدار نہ بناؤ، اسی سے بطانت کا لغت بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ باطن ہے اور حقیقتِ عرفان کا مالک ایسا کہ کوئی ادراک اس کا احاطہ نہیں کرسکتی کیونکہ اس کی کُنہ ذات سے حسِ ابصار اور ادراکِ افکار کوتاہ ہیں۔
۶۰	اَلْوَالِیُ	جمیع امور کا متولّی	ہر چیز پر اپنی مشیّت کے مطابق کامل تصرّف کرنے والی ذات کو والی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی لیے والی ہے کہ تولیتِ امور اسی کو حاصل ہے۔ ہر شئے پر اسی کا تصرّف ہے اور تمام تر کائنات پر اسی کی ولایت فرمانروا ہے۔ یہ لفظ ولایت بالفتح ہے جس کے معنے تولیت اور مِلک کے ہیں۔
۶۱	اَلْمُتَعَالِیُ	نہایت بلند تر	یہ اسمِ پاک علو سے ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر بلند سے بلند ترین ہے اور مخلوق کی بلندیوں سے

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			منزہ ہے۔ ہر بلند کو اسی سے بلندی ملی ہے۔ اور علوِ ذاتی اسی ذاتِ واحد کے لیے ہے جو قیاس و خیال و وہم سے برتر ہے۔ دفتر تمام ہو جاتے ہیں مگر اس کی شانِ بلند کا اندازہ ہونا ناممکن ہے۔
۶۲	اَلْبَرُّ	احسان فرمانے والا	وہ تمام امورِ خیر جن کی اکثر انسان کو احتیاج ہوتی ہے سب کے لیے مولا کریم محسن ہے اور اپنے بندوں پر احسان فرماتا ہے۔ دنیا کی حاجات و اسباب اور آخرت کی نعمتیں عطا فرمانا اسی کا احسان ہے۔ وہی ہے جو اپنے بندوں کو ابرار کا خطاب مرحمت فرماتا ہے۔
۶۳	اَلتَّوَّابُ	توبہ قبول فرمانے والا	توبہ سے ماخوذ ہے، شرع میں توبہ کے معنی ہیں، بُری حالت سے ترکِ عیب گذشتہ پر ندامت اور آئندہ بدی سے بچنے پر پختہ عزم اور تدارکِ مافات۔ لغت میں اسکے معنے بازگشت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا توّاب ہونا اس کے رحم پہ ہے، وہ بندوں کے عیب دیکھتا اور توبہ قبول فرماتا ہے۔ اس لیے کہ توّاب کے ساتھ اسکی ذات رحیم بھی ہے۔
۶۴	اَلْعَفُوُّ	گناہ معاف فرمانے والا	اس کے معنے چھوڑ دینا یا ترک کر دینا ہیں۔ اللہ تعالیٰ عفوٌّ ہے یعنی سب سے زیادہ معاف فرمانے والا۔ اگر معافی کا اصول صحیح ہے اور انسان اللہ کریم سے معافی کی درخواست کرنا، معافی کی دعا کرنا اور معافی کی امید رکھنا پسند کرتا ہے تو یہی برتاؤ اس کو اپنے کمزور ہمجنسوں سے بھی کرنا چاہیئے

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			عفو ہمیشہ طاقتور کی طرف سے ہوتا ہے۔ جو اسکی شان کے شایاں ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضورؐ نے ان کی اس درخواست پر کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر مجھے لیلۃ القدر مل جائے تو اس رات کیا دعا کروں، ارشاد فرمایا کہ یہ کہو یا اللہ تو عفو ہے معافی دینا تجھکو پسند ہے لہٰذا مجھے معاف فرما دے۔
۶۵	اَلرَّؤُفُ	شفیق	یہ اسم رأفت سے مشتق ہے جس کے معنے ازالۂ ضرر کے لیے مہربانی فرمانا ہے۔ بعض علماء کرام نے اس کے معنی شدید رحمت لیے ہیں۔ مولا کریم رؤف ہے۔ اس لیے کہ اس کی شفقت واحسان تمام تر مخلوق پر بلا سبب، بے منّت، بے استحقاق اور بغیر درخواست کے عام ہے۔ جو اس کی ذات کا خاصہ ہے۔
۶۶	اَلْجَامِعُ	جمع فرمانیوالا	جمع سے ماخوذ ہے جس کے معنے ایک چیز کو دوسری کے قریب تر کر دینے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس لیے جامع ہے کہ اس نے اربعہ عناصر کو جمع فرمایا۔ اجزائے مادہ کو جمعیت دی اجسام وارواح کو اکٹھا کیا، نباتات وجمادات میں مختلف اثرات جمع فرما دیے۔ حیوانات کو ایک دوسرے کے قریب تر اور اجرامِ سماوی کو کششِ اتصال سے متصل کر دیا۔ ہر متفرق کو جمع فرمانا اسکی صفتِ جامع میں داخل ہے
۶۷	اَلْغَنِیُّ	بے احتیاج	غنی غنا سے ہے جو کسی کا دست نگر نہ ہو اسکو غنی کہتے ہیں۔ اللہ کریم اس لیے غنی ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے کسی شخص اور

شمارہ	اسمار الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			کسی شئے کا محتاج نہیں۔ بلکہ جملہ عوالم سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اپنے کرم سے سب کو سب کچھ دینے والا ہے۔
۶۸	اَلنُّوْرُ	روشن کرنیوالا	نور کا لفظ محسوس اشیاء میں اور بعض اوقات غیر محسوس میں مستعمل ہوا ہے۔ توحید و ایمان، دینِ حقہ، قرآنِ کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم، تعلقِ الٰہی بذریعہ کتاب اللہ، شانِ ایمانی، اللہ کریم کا اسمِ مقدس بھی نور فرمایا گیا ہے۔ نورِ قلب، نورِ ایمان اور نورِ عقل کے الفاظ بھی مرویات میں ملتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نور ہے۔ اس کا محبوب نور ہے، اسکی کتاب نور ہے اور اسکا دین بھی نورٌ ہے۔
۶۹	اَلْھَادِیُ	ہدایت فرمانیوالا	اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت چار قسم پر بیان ہوئی ہے جس کے معنے دلالت بلطف کے ہیں۔ اوّل :- وہ ہدایت جو ہر قسم کی مخلوق کو حاصل ہے اور جس سے ہر مخلوق اپنی مقتضیاتِ فطرت کو پورا کرتی ہے۔ دوئم :- وہ ہدایت ہے جسکی تبلیغ انبیاء کرام علیہم السّلام نے کی ہے۔ سوئم :- وہ جس کے معنے توفیق کے ہیں، جس سے بعض بندوں کو بعض پر فوقیت ہے۔ چہارم :- وہ ہدایت ہے جو آخرت میں اہلِ ایمان کو حاصل ہوگی جس سے وہ اللہ تعالےٰ اور جنت کی راہ اور مقامات کو پہچان لیں گے۔

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			ان ہی چاروں ہدایتوں سے نظامِ عالم قائم ہے۔ اور ان ہی سے اصلاح امورِ معاش، حقائقِ اصلیہ پر انبیاء علیہم السّلام اور مخلصین کے لیے کشف و الہام، اربابِ دانش کے لیے عقل و حکمت اہلِ طاعت کے لیے توفیقِ خیر ملتی ہے۔
۷۰	اَلْبَدِیْعُ	موجدِ کل	بدع سے مشتق ہے۔ جس کے معنی بغیر نمونہ کے کسی نئی چیز کے بنانے یا ایجاد کرنے کے ہیں۔ شرعی معنوں میں بدعت اسی لیے ہر اُس کام کو کہتے ہیں جو بحکم خدا اور رسولِ خدا پہلے نہ ہو۔ ان ہی معنوں میں اسم بدیع قرآنِ پاک میں بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس وقت جب کہ ان کی کوئی مثال اور نمونہ موجود نہیں تھا۔ گویا اللہ تعالیٰ تمام تر کائنات کے پیدا فرمانے میں بدیع ہے جس کی مثل نہ تھی۔
۷۱	رَابٌّ	پرورش کنندہ	یہ مصدر ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت جس کے ماتحت مولاکریم ہر چیز کو ترقی دیتے ہوئے اس کے درجۂ کمال تک پہنچاتے ہیں طبیعت و فطرت کے مطابق بڑھانا، پالنا، شرفِ نوعی میں بلندی بخشنا اسی کا کام ہے۔ بے شمار کائنات کی تربیت فرمانا اور عرفانِ الوہیت کے دروازے کھولنا رب العالمین ہی کی ربوبیت میں داخل ہے۔ اسکی ذات سارے جہانیوں کی مربی ہے۔ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جہان اور جہانیوں میں کون کون داخل ہے اور اُن کی وسعت کتنی ہے۔
۷۲	مُبِیْنُ	آشکار	اللہ تعالیٰ ایسا آشکار ہے جسکی ذات کے لیے کسی دلیل کی

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			حاجت نہیں مصنوعات کی ہر چیز اور ہر چیز کے اجزا اسکی قدرت و خالقیت کے مظہر ہیں۔ جملہ بیتاب کا ظہور اسی کی تبئین سے ہے۔ کتاب مبین کا نزول حضور علیہ السلام کو مبینہ بنا کر بھیجنا۔ انسان کو بیان سکھانا اسی کے مبین ہونے پر شاہد ہے۔
۷۳	اَلْقَدِیْرُ	قدرت والا	قدر سے ماخوذ ہے جس کے معنے اندازہ اور طاقت کے ہیں اللہ تعالیٰ قدیر ہے جو باقتضاء حکمت خود ہر ایک فعل کا فاعل ہے جس میں کمی بیشی ممکن نہیں۔
۷۴	اَلْحَافِظُ	حفاظت فرمانے والا	حفظ سے مشتق ہے۔ اس کے معنے کسی شئے کو تباہی سے بچانے اور بحال رکھنے کے ہیں۔ جملہ اشیاء عالم کا محفوظ ہونا اسی حفاظت پر ہے۔ مولا کریم حافظ ہے جس نے قرآنِ کریم کو محفوظ فرمایا اور ہمیشہ کے لیے اسکی حفاظت کے وعدے کو آشکار کیا۔ کائنات کی کوئی شئے اسکی حفاظت سے باہر نہیں۔
۷۵	اَلْکَفِیْلُ	ذمہ دار	کفل سے ہے جس کے معنے دوسرے کی ضروریات کی ذمہ داری لینے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی حقیقت پر کفیل ہے جو ہماری حاجات و مرادات کو پورا فرماتا اور مقاصد و مطالب کو مکمل کرتا ہے۔ ہمارے رزق، ہماری ضرورتیں، ہماری عمریں اسی کی کفالت میں ہیں۔ اور ہماری جانوں اور ایمانوں کا بھی کفیل و ذمہ دار وہی ہے
۷۶	اَلشَّاکِرُ	رضامند و قدر شناس	شکر کے معنی اظہارِ ہمدردی کے ہیں، یعنی کوئی شخص کسی کے فعل کو قبول فرمائے اور اس پر رضامند ہو جائے تو یہ شکر کہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ چونکہ بندوں کی خدمات، اعمالِ حسنہ شکر گزاری کو

شمارہ	اسمار الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			شرفِ اجابت بخشتاہے ۔اس لیے اپنا اسمِ پاک شاکر فرماتا ہے شکر کی حقیقت یہ بھی مذکور ہے کہ صاحبِ نعمت کے سامنے اظہارِ خشوع ، صاحبِ نعمت سے محبّت ، اعترافِ نعمت ۔ صاحبِ نعمت کی رضا پر استعمالِ نعمت کیا جائے ۔ بعض بزرگوں نے لکھاہے کہ شکرِ نعمت یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل نہ سمجھے اور نعمت کی بجائے نعمت دہندہ کو دیکھے ۔
۷۷	اَلْاَکْرَمُ	بہت بزرگ	کرم کے معنے بزرگی کے ہیں اور اکرم وہ ہے جو صاحبِ قدرت ہو کر عفو کرے ۔ چنانچہ ربّ العزّت کی ذات میں وہ عظمت جو اُس کی شان کے شایان ہو اکرم کے مفہوم میں سمجھی جائیگی ۔ وہی جود و کرم کا مالک ، وہی جاہ و کرم بخشنے والا ، وہی غنا و کرم عطا کنندہ وہ ہی بندے کو مکرّم بنانے والا ہے ۔
۷۸	اَلْاَعْلٰی	برتر	یہ اسم علو سے ہے جسکی مثال نہ ہو اور اس کی شان ہر اس بلندی سے ارفع و اعلیٰ ہو جو اسکی قدرت یا حکم میں کسی کو مشترک سمجھا جائے ۔ اسی بنا پر مولا کریم اپنی علوِ شان میں بے مثل بلندی کے مالک ہیں ۔
۷۹	اَلْخَلَّاقُ	پیدا فرمانے والا	یہ اسم خلق سے بنا ہے جس کے معنے اندازہ کرنے کے ہیں یعنی خلّاق وہ ہے جو ماہیّات کا اندازہ اور ذوات کا تعیّن فرمائے اور حقائق کو عدم سے وجود میں لائے ۔ یہ صفت باری تعالیٰ کی ہے جس نے نور ، نار ، خاک سے مخلوق بنائی اور ہوا میں اڑنے ، پانی میں رہنے ، مٹی پر چلنے ، زمین کے اندر گھر بنانے والی تمام مخلوق

شمارہ	اسمار الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			اسی خلّاق کی پیداوار ہے۔ انسان اگر اس کی مختلف قسم کی مخلوقات کا ذرا سا بھی تصور کرے تو اُس کی خلاقی کا عرفان اس کو خلاق ماننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔
۸۰	اَلْمَوْلیٰ	مددگار	یہ اسم وَلا سے ہے جو دو چیزوں کے درمیانی تعلق کو ظاہر کرتا ہے یعنی ہر وہ شخص جو ایک دوسرے کے کام آئے۔ وہ مولا کہلاتا ہے اللہ کریم کا یہی تعلق بندوں سے ہے۔ کہ وہ بندوں کی نصرت فرماتا ہے اور حقیقی ولایت دونوں جہان میں اسی کو حاصل ہے۔ بندے کا کمالِ ایمان یہی ہے کہ اپنے آپ کو اسی کی تولیّت میں دیدے۔
۸۱	اَلنَّصِیْرُ	نصرت دینے والا	یہ اسم بندہ اور مولا دونوں کی جانب مستعمل ہے۔ بندہ کی جانب سے اللہ کی نصرت کے معنے یہ ہیں کہ اللہ والے بندوں میں باہمی نصرت قائم ہو جائے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ کے حکموں کی حفاظت، حدود و معبود کی رعایت، عہود کی پابندی اور اوامر و نواہی کی پوری اطاعت و تعمیل یہ سب نصرت کے مفہوم میں داخل ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نصرت تو واضح ہے جو بندوں کے حق میں بیان ہوئی ہے۔ کہ اللہ کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اس وقت فرمائی جب کفار نے ان کو نکال دیا۔ گویا ہجرت میں حضور علیہ السلام کا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تشریف لے جانا اور غار میں محفوظ ہونا نصرتِ الٰہیہ کا ایک پہلو تھا۔
۸۲	اَلْمُقْسِطُ	منصف	قسط عربی زبان میں بمعنے انصاف آیا ہے یعنی حکم میں ایسا انصاف کرنا کہ مظلوم کی رضامندی میں ظالم کی رضامندی بھی

شمارہ	اسمار الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			شامل کر دی جائے گویا مقسط وہ ذات ہے جو مظلوم کا ظالم سے کماحقہٗ انصاف لے۔
۸۳	اَلْاِلٰہُ	معبود	اللہ تعالیٰ کے اسم ذاتی اللہ کے ساتھ اِلٰہ کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ بھی اسم ذات ہی ہے۔ قرآن کریم میں اکثر جگہ استعمال ہوا ہے۔ کہیں بحالت نفی اور کہیں بصورتِ مثبت۔ اس لیے بزرگانِ دین نے اسکو بھی اسمار الحسنیٰ میں شمار فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ عبادت، دعوت اور وحدت کو اس سے خاص تعلّق ہے۔
۸۴	اَلْعَلَّامُ	بہت عالم	علم سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اور صفتِ علم عالم الغیب کے ساتھ اس کا بہت رابطہ ہے۔ انسان کا علم اشیاء حاضرہ اور غائبہ کے ساتھ جداگانہ طور پر نسبت رکھتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا علم ایسی تفریق و تحدید سے پاک ہے۔
۸۵	اَلْقَاھِرُ	غالب ترین	یہ اسم قہر سے ہے اور قاہر وہ ذات ہے جو ہر غالب پر غالب ہو حاکم کل۔ سب پر حکمران، غلبۂ تام کا مالک اور واحد و قاہر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ یہ اسم واضح کرتا ہے کہ وجود کو اعیان پر اور واجب الوجود کو امکان پر کس طرح غلبۂ کُلّی حاصل ہے۔ بلندیٔ ذات اور برتری صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ساری کائنات اس کے آگے سربسجود ہے۔
۸۶	اَلْفَاطِرُ	خالق فطرت	فطر سے ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں کسی نمونہ کے بغیر کسی شے کا بنانا۔ جس میں کوئی نقص، کوئی کمی اور کوئی فطور نہ ہو۔ فطرت

مختصر تشریح	ترجمہ	اسماء الحسنیٰ	شمارہ
کے معنے پھاڑنے کے بھی ہیں۔ کسی چیز میں شگاف اور دراڑ پڑنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ یعنے کسی شے کو پھاڑ کر پیدا کرنا اور نکالنا بھی ان ہی معنوں میں آتا ہے۔			
وہ ذات جس کو چاہے ملک عطا فرمائے اور جس سے چاہے چھین لے یہ اسم ملیک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کے لیے مستعمل نہیں ہوا۔ کیونکہ وہی بلاشرکت غیرے تمام ملک کا مالک حقیقی ہے۔ اسکی مِلک داری میں کسی کو شرکت کا استحقاق حاصل نہیں۔ ہر شے کی مَلکُوت اسی کے قبضہ میں ہے۔ وہی حکومت عطا فرماتا ہے اور تمام ملائکہ اور ملوک اسی کی ملکیت میں ہیں۔ ملیک اور مالک اور ملک تینوں الفاظ متقارب المعنےٰ ہیں اور ملک سے ماخوذ ہیں۔	بے شرکت مالک	اَلْمَلِیْکُ	۸۷
حفی کے معنے بہت مہربان کے ہیں۔ جو مخلوق کی پرسشِ احوال فرمائے۔ سائلوں کی عرض و معروض سُننے اور دعاؤں کو شرفِ اجابت بخشنے۔ اللہ تعالیٰ اس لیے بھی حفی ہے کہ وہ ازراہِ مہربانی بندوں کو عملِ نیک کی توفیق مرحمت فرماتا ہے۔ اکثر حضرات نے اسم حفی کو اسماء الحسنیٰ میں شمار نہیں فرمایا۔ مگر شیخ الاسلام حافظ احمد بن علی مصری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق میں ہے جن سے فقیر نے استفادہ کیا ہے۔	انتہائی نوازش فرمانے والا	اَلْحَفِیُّ	۸۸
محیط کے معنے گھیرنے والا اور حفاظت فرمانے والا کے بھی آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یوں محیط ہے کہ وہ جمیع جہات	احاطہ کرنے والا	اَلْمُحِیْطُ	۸۹

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			سے حفاظت فرماتا ہے اور تمام مخلوق کو ہر پہلو سے گھیرے ہوئے ہے اور ایسا کہ سب کی پیدائش اور غرض و انجام سے من کل الوجوہ واقف ہے۔ اسکی قدرت کاملہ ان تمام امور مکانی و زمانی کو حاوی ہے جن پر انسان کسی طرح بھی حاوی نہیں ہو سکتا۔
۹۰	اَلْمُسْتَعَانُ	مددگار	استعانت بمعنی مدد مانگنا ہے۔ اور استعانت خاص ربّ العالمین کا خاصہ ہے اور ان امور میں مستعمل ہے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔ مثلاً افزائش عمر، کشائش رزق بخشش اموال، عطاء اولاد، حیات و ممات، فلاح آخرت تمناؤں کی تکمیل، مصائب و نوائب سے نجات، سب مولیٰ کریم کی ہی قدرت سے وابستہ ہیں اور غیر اللہ کی مدد و استعانت اسی لیے شرکِ جلی ہے۔
۹۱	اَلرَّفِیْعُ	بلندی والا	رفیع رفعت سے ہے۔ جو سب سے بالاتر ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو درجات بلند عطا فرماتا ہے اور بعض کو بعض پر درجہ میں بلندی بخشتا ہے۔ رفعت کا بخشنا اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ خود ایسا رفیع ہے جسکی مثل ناممکن و محال ہے۔
۹۲	اَلْکَافِیْ	ہر امر میں کفایت کرنے والا	کفایت کے معنے حیثیت کے مطابق ہر کسی کو پورا کر دینے کے ہیں اور کسی کام کا حسبِ مراد بن جانا کفایت کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر کام میں مومنوں سے کفایت کا وعدہ فرماتا ہے

مختصر تشریح	ترجمہ	اسماء الحسنیٰ	شمارہ
اور اپنی ہی کفایت کا اعتماد دلاتا ہے۔ اور کفار کو اُن کی بیہودہ باتوں پر سزا کے لیے کافی بتاتا ہے اور اناکفینٰک المستھزئین کا وعدہ فرما کر نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کفایت کا جلوہ نمودار کیا۔			
اللہ تعالیٰ کا اسم غالب اس لیے ہے کہ ساری کائنات پر اُس کا قابو ہے۔ اور کوئی اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں۔ عربی لُغت میں غلبہ گردن پکڑ لینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں مختلف اعمال پر غلبہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کا فرمان سچ ہے اور اسی کی ذات بے شک غالب ہے۔ صداقت کا معارضہ کرنے والے اور ایمان باللہ سے عداوت رکھنے والے اپنے ظاہری طمطراق پر بھروسہ کر کے متکبّرانہ لہجہ میں کہا کرتے ہیں آج تم سے اوپر کوئی نہیں مگر قدسی آواز (اللہ ہی کی فوجیں غلبہ پائیں گی) کہہ کر ان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیتی۔	قابو یافتہ	غَالِبُ	۹۳
یہ اسمِ پاک منّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی احسان کے ہیں۔ لغت میں بھی اس کے معنی احسانِ عظیم فرمانے والا ہے جس کے احسانات سے تمام کائنات دبی ہوئی ہو۔ قرآنِ کریم میں سب سے بڑا احسان رب العزّت نے سیّدنا افضل الانبیاء محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ہدایت مخلوق کے لیے مبعوث فرما کر بیان فرمایا ہے اور حقیقتاً یہ وہ احسان ہے جس کا بدلہ کوئی انسان ادا نہیں کر سکتا۔ بندے کو چاہیئے کہ منّت کو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات مقدّس و برتر کا خاصہ سمجھے۔	احسان فرمانے والا	اَلْمَنَّانُ	۹۴

شمارہ	اسمار الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
۹۵	ذوالجلال	بڑی عزت و عظمت والا	اللہ تعالیٰ کا یہ اسمِ پاک اس لیے ہے کہ وہ عظمت ذاتی کا مالک ہے۔ اور جلالتِ نفسی اسی کے لیے ہے بعض علماً نے لکھا ہے کہ یہ اسم کمال صفاتی سے متعلق ہے۔ اور صفاتِ قہریہ کا مظہر ہے اور اسی کی ذات ایسی ہے کہ اس کی ہیبت ہر لحظہ پیشِ نظر رکھی جائے۔
۹۶	المحی	زندہ کرنے والا اور الہام بخشنے والا	یہ احیاء سے ہے۔ جس کے معنے حیات آفرینی کے ہیں۔ مولا کریم محی ہے کہ اس نے ہی سب کو حیات بخشی ہے اور عدم سے وجود میں لایا ہے۔ وہی مردہ زمین میں نشوونما کی قوت پیدا فرماتا ہے اور وہی مردہ قلوب کو زندگی بخشتا ہے اسی نے بیج کو زندگی بخش کر تن آور درخت اور انڈا کو جانور اور نطفہ کو جیتا جاگتا حیوان بنا دیا ہے۔
۹۷	الممیت	مارنے والا	موت سے ہے۔ یعنی وہ حالت جو زندگی کے بعد طاری ہوتی ہے بعض نے اسکی تعریف یہ بھی کی ہے۔ کہ موت وہ کیفیت ہے جس میں زوالِ حرکت و زوالِ عقل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس لیے ممیت ہے کہ موت اس کی مخلوق ہے۔ اور موت کو اس کے دامنِ جلال تک رسائی نہیں بلکہ طاقتور کو مٹانا۔ آبادیو کو ویران کرنا۔ دشمن کو نیچا دکھانا اسی کا کام ہے۔ اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔
۹۸	الوارث	ہر قسم کی وراثت کا استحقاق رکھنے والا	وِرث کسی چیز کا کسی کی موت کے بعد جس کے پاس وہ چیز تھی کسی دوسرے کی طرف منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق

مختصر تشریح	ترجمہ	اسماء الحسنیٰ	شمارہ
اللہ تعالیٰ کی طرف محض عرفِ عام میں ہے ورنہ وہ مالکِ حقیقی ہے قرآنِ پاک میں دو مقام پر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے استعمال ہُوا ہے۔ ایک سورۂ قصص میں ارشاد ہوتا ہے کہ بہت سی متکبّر اقوام گزری ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا اور وہی اُن کا وارث بنا اور سورۂ حجر میں ہے۔ کہ ہم ہی زندہ کرتے ہیں۔ ہم ہی مارتے ہیں۔ اور ہم ہی وارثِ املاک ہیں۔ گویا مولا کریم چونکہ قدیم اور ابدی ہے۔ اس لیے فنا رموجودات کے بعد وہی باقی اور وارث ہے قرآنِ کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ وراثت میں منصبِ روحانی کی جانشینی بھی داخل ہے۔ جیسے کہ داؤد علیہ السلام کی وراثت روحانی کا تذکرہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حق میں ہوا ہے ایسے ہی حضرت زکریا اور حضرت یوسف علیہما السلام کی وراثتوں کا بیان ہوا ہے جو منصبِ روحانی ہی سے متعلق ہے			
بعث کے معنے ہیں اٹھانا۔ بیدار کرنا کسی کو کسی جگہ بھیجنا اللہ تعالیٰ اس لیے باعث ہے کہ اس نے رسولوں کو خلقت کی طرف مبعوث فرمایا۔ اور عام مخلوق کو عدمِ محض سے پیدا کیا اور وہی قیامت کے دن سب کو زمین سے اٹھائیگا۔ قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ تم موت کے بعد ضرور اٹھائے اور زندہ کیے جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ ان کو اٹھائے گا اور زندہ کرے گا جو قبروں میں ہیں۔	اُٹھانیوالا	اَلْبَاعِثُ	۹۹
ہمیشہ حالت اوّل پر قیام صرف ذاتِ الٰہ العٰلمین ہی	قائم دائم	اَلْبَاقِی	

شمارہ	اسماء الحسنیٰ	ترجمہ	مختصر تشریح
			کو ہے اور دوام ابد اُسی کی ہستی کے لیے کیونکہ وہ موت کا خالق ہے۔ اور کوئی مخلوق اپنے خالق پر غالب نہیں آسکتی۔ ہر ایک شئے ہلاک ہونیوالی ہے اور وہ باقی جو ہر عمل کو بقا بخشتا ہے، وہی دائم الوجود واجب الوجود اور قائم البقاء ہے۔ جو اشیاء ہمارے سامنے ہیں۔ اُن کی عارضی بقاء بھی اسی کی عطا ہے۔

ذات وصفاتِ باری تعالیٰ

قرآنِ کریم میں جابجا خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ کے افعال وصفات کا ذکر ہے اور بار بار اسکی ذات پر ایمان لانے کو بیان فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہی سب سے پہلی چیز ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں اور کتاب اللہ کے ہر صفحہ پر ایسی آیات دکھائی دیتی ہیں جو اللہ کریم کی توحید ذاتی وصفاتی اور عظمت و جلال پر دلالت کرتی ہیں اور ان پر غور کرنے سے اس پر ایمان لانا یقینی ہو جاتا ہے اور جب ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو صحیح معنوں میں تسلیم کر لیا جائے تو پھر فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کا حکم مانا جائے۔

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں چار باتیں داخل ہیں :-

۱۔ ذاتِ الٰہی
۲۔ صفاتِ الٰہی
۳۔ افعالِ الٰہی
۴۔ تصدیقِ رسالت

یہ چاروں امور بطور ایجاد کے کلمۂ شہادتین میں بیان ہوئے ہیں اور ان ہی چاروں پر ایمان کی بنیاد ہے اور ان میں سے دوسرے رکن کے یہ دس اصول ہیں۔ خدا زندہ ہے۔ عالم ہے۔ قادر ہے صاحبِ ارادہ ہے۔ دیکھتا ہے، سنتا ہے۔ بولتا ہے۔ حوادث کا محل نہیں۔ اس کا کلام قدیم ہے۔ اور اس کا علم وارادہ بھی قدیم ہے۔ اور تمام عقائدِ اسلامیہ ان ہی پر منحصر ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ پر ایمان لانے کے یہ معنے ہیں کہ مومن ان صفات کو جان لے جو اللہ کریم کی شایانِ شان ہیں اور اُنکی نقیض سے بری رہے۔ اس بات پر اعتقادِ جازم رکھے کہ اللہ تبارک تمام صفاتِ کمال جو شایانِ الوہیت ہیں کا سزاوار اور تمام عیوب ونقائص سے پاک ومنزہ ہے۔ خداوندِ عالم کی نسبت اجمالی طور

پر صرف اتنا عقیدہ رکھنا گو ثبوت توحید کے لئے کافی ہے مگر ان تیرہ صفات پر بالتفصیل ایمان لانا جن پر مدارِ الوہیت اور عظمت شان الوہیت ہے وہ تیرہ صفات یہ ہیں۔

۱۔ خداوندِ عالم جلّ شانہ' کا وجود، اسکی ضد عدم ہے۔

۲۔ وہ قدیم ہے اس کی ضد حادث یعنی پیدا ہونا ہے۔

۳۔ وہ باقی رہنے والا ہے اس کی ضد فنا ہونا ہے۔

۴۔ حوادث کے مخالف ہے اسکی ضد مماثلت یعنی جوہریّہ، عرضیّہ اور جسمیّہ ہے۔

۵۔ قائم بنفسہٖ ہے یعنی اس کا قیام کسی غیر کا محتاج نہیں اس کی ضد قیام بغیرہٖ ہے۔

۶۔ واحد ہے۔ اسکی ضد متعدد ہونا ہے۔

۷۔ صاحبِ ارادہ ہے۔ یعنی اس پر کسی کا زور اور دباؤ نہیں اسکی ضد مقہوریت ہے۔

۸۔ قدرت والا ہے۔ اس کی ضد عاجز ہونا ہے۔

۹۔ علیم ہے۔ اس کی ضد جہل ہے۔

۱۰۔ سمیع (سننے والا) ہے۔ اس کی ضد بہرہ ہونا ہے۔

۱۱۔ بصیر (دیکھنے والا) ہے۔ اس کی ضد اندھا ہونا ہے۔

۱۲۔ کلام فرماتا ہے۔ اس کی ضد گونگا ہونا ہے۔

۱۳۔ حیّ یعنی زندہ ہے اور اس کی ضد موت ہے۔

مومن کو لازم ہے کہ ان صفات کا خداوندِ عالم کے حق میں اثبات کرے اور دل میں پختہ یقین رکھے اور ان کی اضداد سے خدائے قدوس کی ذات سے نفی کرے اور اس کے حق میں ان کو محال جانے۔ کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں مخلوقات سے جدا ہے اسی طرح اس کی صفات بھی مخلوقات سے جدا ہیں۔ مخلوق سماعت و بصارت اور کلام میں کان آنکھ اور زبان کی محتاج ہے اور یہ مخلوقات کا خاصہ ہے۔ مگر واجب الوجود اور خداوندِ عالم اس سے بری ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان جب خدا کی صفات کا صحیح طور ادراک نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً خداوندِ عالم کی صفات کو اپنی صفات پہ قیاس کرنے لگ جاتا ہے۔

حالانکہ خداوندِ عالم کی ذات کا تصور اس کی صفات کے تصور سے الگ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسانی عقل ذاتِ مجرد کے تصور سے عاجز و درماندہ ہے۔ وہ جب اسکی ذات کا تصور کرنا چاہے تو اس کے تصور میں اپنی صفات ہی آتی ہیں۔ اب صفات کے تصور میں یہ مشکل ہے کہ خدا کی صفات انسانی صفات سے الگ ہیں۔ انسان جب چاہتا ہے کہ اپنے خالق و معبود کی شکل و شباہت دیکھے اور صفاتِ الٰہی کا نقشہ کھینچے تو اس کا ذہن نکرا اپنے ذہن و تصورات کے آئینہ میں خود اپنا ہی چہرہ دیکھتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ اس سے بلند ترین ہے کہ اس کو عقل و حواس سے قیاس کیا جا سکے یا وہ دیگر اعراض کی طرح محل صفات ہو اور اس کو الفاظ عرفی پا سکیں۔ پس ضروری ہے کہ اس کی تعریف اس طرح کی جائے کہ اس کے کمال کی تصویر ذہنِ انسانی میں کھنچ جائے پس لازم ہوا کہ صفات کا استعمال کیا جائے مگر اس طریق پر کہ ان سے مراد صفات کی غایات و لوازم ہوں نہ کہ بمعنی مبادی۔ لہٰذا خدا کی رحمت کے معنے نعمتوں کا فیضان ہے نہ کہ قلب کی رقت۔ اور اس کی تسخیر و قوت کے لیے تمام موجودات کیواسطے استعارات بھی لیے جائیں۔ جب کہ ان معانی کو ادا کرنے کا اس سے زیادہ اور کوئی فصیح طریقہ نہیں اور تشبیہات کا اس شرط سے استعمال کیا جائے کہ ان سے مقصود حقیقی معانی نہ ہوں بلکہ شانِ الوہیت کے مناسب کنائی طور پر معانی لیے جائیں۔

صاحبِ کتاب الاسلام نے لکھا ہے کہ خدا کی صفات کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ خداوندِ عالم جل وعلا شانہٗ کی صفات مذکورہ کو محض آثار کی مشابہت کی وجہ سے مخلوق کی صفات کے ساتھ صرف اسمی مشارکت ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے پورا پورا اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیونکہ مخلوق کی صفات حادث اور خالق کی صفات قدیم ہیں۔

شیخ حسین آفندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ اتنی ہی صفات جو خداوندِ عالم جل جلالہٗ کے لیے ثابت ہوئیں۔ ہرچند کہ خدائی کا مدار ٹھہر سکتی ہیں اور وہ صفات وجود، ارادہ، علم، قدرت، قدم، بقا حوادث کے ساتھ مخالفت، اس کا بنفسہٖ قائم ہونا، وحدانیت اور حیات ہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ ان ہی صفات کے ساتھ متصف ہو تب بھی وجودِ کائنات کی علت بننے کے لیے کافی سمجھا جا سکتا ہے

مگر ہم نے خدائے پاک کی شان میں اور بھی غور کرنا شروع کیا اور اسکی عجیب وغریب مصنوعات اور ان کی کمال پائیداری میں تامّل کیا تو معلوم ہُوا کہ جب اس کی مصنوعات میں یہ کمال موجود ہے تو کیا اس کی ذات پاک صفات کمالیہ میں سے کسی صفت میں خود ناقص بھی ٹھہر سکتی ہے، ہرگز نہیں۔ بلکہ جہاں تک ہم خیال کر سکتے ہیں کسی کو بھی ایسا نہیں پاتے کہ اپنے مثل کوئی شئے ایجاد کر سکے۔ پس ہم نے اعتقاد کر لیا کہ خدائے قدوس سمیع بصیر متکلم اور تمام صفاتِ کمالیہ کے ساتھ جو اس کی ذات کے شایاں ہیں متصف ہے۔ اس لیے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ وہ بہرا، اندھا اور گونگا ہو۔ اور پھر اسی نے قوتِ سماعت کو پیدا کیا ہو۔ آنکھیں روشن کی ہوں۔ کلام کے ساتھ زبان کو جاری کیا ہو۔ اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ خود صفتِ کمالیہ میں ناقص ہو۔ پس ہم خداوندِ عالم جلّ وعلا شانہٗ کی جتنی صفات کے متعلق اعتقاد رکھتے ہیں وہ حوادث یعنی مخلوقات کی سی صفات نہیں اور نہ حقیقت میں انکی مشابہت رکھتی ہیں۔ صرف آثار کی مشابہت کی وجہ سے مشارکت اسمی ہے۔ ربّ کائنات سننے میں ہماری طرح کان کا محتاج نہیں بلکہ یہ صفت اسکی قدیم ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے جس سے کہ تمام مسموعات اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس کا دیکھنا آنکھ کی پُتلی پر موقوف نہیں بلکہ اس کی یہ صفت بھی قدیم ہے۔ جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ جس سے کہ تمام مبصرات اس کے نزدیک منکشف ہو جاتے ہیں اور اس کا کلام بھی ہماری طرح زبان کا محتاج نہیں بلکہ اس صفت قدیم کے ذریعے سے وہ اپنی مخلوقات میں سے جس کسی کو جو کچھ سمجھانا چاہتا ہے سمجھا سکتا ہے۔ پس اسی پر تمام باقی صفات کو قیاس کرنا چاہیئے۔

یہاں پر یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ صفات باری تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ کی دو قسمیں ہیں (۱) ذاتیہ (۲) فعلیہ۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جس صفت سے اللہ تعالیٰ جلّ جلالہٗ موصوف ہو سکے اور اسکی ضد سے پاک ہو وہ ذاتیہ ہیں۔ مثلاً وہ علیم ہے۔ مگر اسکی ضد جہل ہے جس سے متصف نہیں ہو سکتا۔ اور فعلیہ اس کے برعکس ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اسکی ضد سے بھی متصف ہو سکتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ زندہ کرنیوالا ہے اور اسکی ضد مارنے والا سے بھی موصوف ہے۔ بزرگانِ دین نے لکھا ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کے متعلق ہمیں یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ جسطرح خدا کی ذات ازلی و ابدی ہے اسی طرح اس کی صفات بھی ازلی و ابدی ہیں۔ یعنی یہ صفات نہ اسکی عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات اور نہ ہی یہ صفات مخلوق ہیں۔

عقیدۂ توحید

عرصۂ ہستی کا صرف ایک فرمانروائے مطلق ماننا جس کے سامنے ہر جسمانی و روحانی طاقت ادب سے جھکی ہوئی ہے اور ساری کائنات اسی ایک کی مخلوق و محکوم ہے۔ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جو سرتاپا صداقت و حق اور ایسی عالمگیر جو عرصۂ وجود کے ایک ایک ذرّے کو محیط ہے۔ اس میں کوئی تغیّر و انقلاب نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ کیونکہ اسکی بُنیاد ایک ایسی لازوال ہستی کے یقین پر ہے جو مادیات کی دنیا کی طرح دم بدم مٹتی، بنتی اور لحظہ بلحظہ متغیّر و منقلب نہیں ہوتی۔

دنیا میں آنکھیں کھول کر دیکھنے والے انسان کو دو قسم کی اشیاء نظر آتی ہیں۔ جاندار اور غیر جاندار۔ اور اس کو دونو نوع کی اشیاء و اسماء کی حقیقت کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے۔ کسی شخص نے ہوا، روح اور درد وغیرہ کو نہیں دیکھا۔ مگر کوئی بھی ہوشمند اُن کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔ دنیا میں بیشمار چیزیں ایسی ہیں جن کو انسان نے نہ جانا نہ پہچانا، نہ چھوا، نہ دیکھا۔ مگر ان کے وجود کو محض اس لیے تسلیم کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے حکماء، عقلاء، فلاسفر بتا گئے ہیں کہ ان کا وجود ہے۔ عوام کیا، خواص میں بھی کس نے دیکھا ہے کہ زمین گول ہے اور مختلف طبقات سے مرکب ہے۔ ہوا مختلف گیسوں پر مشتمل ہے۔ فضائے بسیط میں ہزاروں برس پیشتر مرنے والوں کی آوازیں اب تک چکّر لگا رہی ہیں۔ غرضیکہ تمام تاریخ وسیر، تمام علوم نظری وطبعی پر ہر شخص یقین کرتا ہے اور محض اس لیے کرتا ہے کہ اسلاف و متقدمین ان کو مرتّب کر گئے ہیں۔ اگر آج ہر شخص اپنے طور پر ہر چیز کی تحقیق کرنے بیٹھ جائے تو وہ ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔ اور اگر وہ اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر کسی شے کے وجود ہی سے انکار کردے تو اسکو کون سلیم الحواس قرار دیگا۔ جبکہ شواہد یہ ہیں کہ ہم خود لبصد ہزار سعی کسی ایک سائنس کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے اور ایک غیر طبیب دورانِ خون کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتا۔

ہم یہاں نیویارک کے متعلق اُن دیکھے ہزار تصوّر قائم کریں۔ ہزار دماغ سوزی سے کام لیں کہ اسکی عمارات کیسی ہیں۔ سڑکوں کی کیا حالت ہے، طرزِ معاشرت کس قسم کی ہے، انتظام کیسا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے علم کے باوجود ہرگز اس کا صحیح تصوّر قائم نہ کر سکیں گے۔ پھر کیا تماشہ ہے کہ اس انسانی عجز و درماندگی کے باوجود ہر شخص خداوندِ عالم کی ذات کے متعلق نظریے قائم کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اور جہاں پہنچ کر اسکی عقلِ نارسا ٹھوکر کھا جاتی ہے انکار کر کے دہریہ بن جاتا ہے۔ یا قطعی بداعتقاد اور بے خوف ہو جاتا ہے اہلِ علم کا فیصلہ ہے کہ ہر چیز کے علم و تصوّر کے لیے اس کے علم میں مہارتِ تامہ کی ضرورت ہے۔ اور خدا شناسی یا معرفتِ الٰہی کے لیے بھی ایک علم ہے جس کی دو شاخیں ہیں۔ **نظری و عملی یا قولی و حالی**۔ نظری علم، علم دین جو بدلائل یؤمنون بالغیب کی تعلیم دیتا ہے اور عملی علم، علمِ احسان (تصوّف ہے) جو سب کچھ بچشم باطن سے دکھلا دیتا ہے۔ اور علم الیقین۔ عین الیقین کے درجات سے گزر کر انسان حق الیقین کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور وہاں عبد و معبود کی پوری حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ جس طرح اور علوم کے معلّم مختلف مشاہیر ہوتے آئے ہیں اسی طرح علمِ احسان کے معلّم انبیاء علیہم السلام اور اُن کے بعد ان کے جانشین اولیاء کرام علیہم الرحمۃ بھی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ درجہ تقرب الی اللہ کا ہے۔ جس طرح دنیوی درباروں میں ہر شخص کو بار حاصل نہیں ہو سکتا اسی طرح مقربین بارگاہِ صمدیت کی تعداد بھی قلیل و کمتر ہوتی ہے۔ اور ہر شخص اس دربار میں بھی بار نہیں پا سکتا۔ پھر جس طرح تمام لوگ سائنس کے اصولوں، طبیعیات کے مسئلوں، تاریخ و سیر کی روایتوں کو ان علوم کے ماہرین و معلّمین کے لکھنے اور بتانے پر باور کرتے چلے آئے ہیں اور ان سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ٹھیک اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ وہ لوگ معلّمین روحانیت کی تعلیمات سے منکر ہو جائیں۔ جن لوگوں نے خداوندِ عالم جل شانہٗ کے وجود، حشر و نشر، جنت و دوزخ، اجنہ و ملائکہ کی ہستیوں سے انکار کیا ہے۔ وہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے اور اسی فاش ٹھوکر سے بہک گئے ہیں۔ ایسے لوگ ہر معاملہ میں اگر دوسرے ہی کی تحقیقات کے محتاج ہیں تو پھر ان کو اپنی عقل کی نارسائی پر جھک مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ایسے ہی کسی لایعقل سے سوال کیا جائے کہ تمہارا باپ کون ہے اور وہ کسی کا نام بتا دے پھر اس سے اس کی دلیل پوچھی جائے کہ وہ کیوں کر تمہارا باپ ہے تو اس پر سوائے اس کے کہ وہ یہ کہہ دے کہ میری ماں کہتی ہے اور اس کا کیا ثبوت

پیش کرسکتا ہے۔ پھر جب کسی کو باپ ماننے کے لیے صرف ماں کی گواہی پر آمادہ ہوجاتا ہے جس پر گناہ کا بھی شبہ ہوسکتا ہے تو اتنی کائنات کے معلمین روحانی کے علم پر کیوں پیدا کرنے والے کو نہیں مان سکتا۔

ہم ریاضی کے اصولوں سے فلسفہ کے مسائل حل نہیں کرسکتے۔ طبعیات سے تاریخ کے نکات کو نہیں کھول سکتے۔ سائنس سے سیاسیات میں کلام نہیں کرسکتے۔ منطق کی موشگافیاں حربیات میں کام نہیں دے سکتیں۔ ایک بڑھئی اپنی نجارانہ مہارت سے آہنگری نہیں کرسکتا تو بالکل اسی طرح ایک فلسفی روحانیت کی دنیا میں بھی نہیں رینگ سکتا۔ کیونکہ فلسفی اگر روحانی امور کی منزل میں قدم مارے گا تو اسکا وہی حال ہوگا جو مادر زاد اندھے کا روشنی میں ہوتا ہے۔ شیخ بوعلی سینا کے متعلق لکھا ہے کہ فلسفہ نے اسے بھی بداعتقاد بنا دیا تھا اور اس کا تخیل بھی الحاد سے آلودہ ہوکر خراب ہوگیا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے کتب خانہ کی کتابیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالیں اور خود کہیں باہر جانے لگا تو اس کی والدہ نے کہا کہ بیٹا اتنی قیمتی کتابیں یوں بے احتیاطی کے ساتھ صحن میں ڈال کر باہر جا رہے ہو اگر بارش آگئی تو میں اکیلی ان کو کیونکر سنبھال سکوں گی۔ شیخ نے کہا۔ اماں بارش کا کوئی امکان نہیں اور نہ ہی موسم ہے۔ مطلع بھی ابر آلود نہیں۔ والدہ نے کہا یہ درست ہے۔ مگر خداوند عالم کو پانی برسانے تو کوئی دیر نہیں لگتی۔ بولے۔ علم نجوم سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ابھی بارش نہ ہوگی اور مجھے پورا پورا اطمینان ہے۔ ماں نے کہا تمھیں اختیار ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ ملحدانہ ہوچکا ہے۔ جاؤ اور جو دل چاہے کرو۔ اللہ تعالیٰ کو شیخ صاحب کے عقائد کی اصلاح و ہدایت مقصود تھی، شیخ اپنے علم کی بنا پر گھر سے نکل گئے تو بعد ازاں غیر متوقع طور پر بادل کی گھٹا اٹھی اور اتنی برسی کہ تمام جل تھل ہوگئے۔ شیخ نادم ہوئے اور گھر واپس آکر سچے دل سے توبہ کی اور سمجھ لیا کہ خداوند قدوس کی قدرت اور کارفرمائیوں میں کسی کو بھی دخل نہیں مشہور ہے کہ تحقیق و بداعتقادی کا خبط جب ختم ہوجاتا ہے، ہر اعتماد شکست کھاجاتا ہے۔ تمام امیدیں منقطع ہوجاتی ہیں۔ ہر راہ بند نظر آتی ہے۔ عقل نارسا کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں اور جنونِ تحقیق کی کشتی منجدھار میں ڈوبنے لگتی ہے تو پھر فلسفی بھی کسی لازوال ہستی کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور اسکی آنکھوں کے سامنے بھی ایک خدائے قدوس کی نصرت کا وثوق اس کو بھی فتح و ظفر سے ہمکنار کرتا ہے۔ اور بداعتقادیوں، مایوسیوں اور ناامیدیوں کے ہر بادل کو چھانٹ کر رحمتِ الٰہی کے نور سے اسکی آنکھیں بھی پُرنور کر دیتا ہے۔

دنیا میں دو چیزیں ہر شخص کو موجود نظر آتی ہیں۔ ایک وہ خود، دوسرے اس کے ارد گرد کی ساکن اور غیر ساکن اشیاء۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی ہوشمند انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنا یا اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا خالق ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی خود اسکی پیدا کی ہوئی ہے۔ مختلف چیزوں سے ترکیب دیکر مختلف چیزیں بنا لینا اور ایسی بہت سی مصنوعات کو میدان میں لے آنا اور بات ہے۔ لیکن کسی چیز کی مدد کے بغیر کوئی چیز ایجاد کر لینا اور چیز ہے۔ اور دنیا کا ہر فلسفی، ہر موجد، ہر سائنسدان اس اعتراف و عجز پر مجبور ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان کو نہ انسان بنا سکتا ہے اور نہ ارد گرد کی اشیاء میں سے ایک پتہ یا لکڑی کا ٹکڑا وجود میں لا سکتا ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس دنیا کا خالق کوئی اور ہے اور وہ وہی خدائے قدوس کی ذات پاک ہے۔

ملحدوں اور دہریوں کا عقیدہ ہے کہ مادہ قدیم ہے اور انسان تدریجی ترقی کرتے کرتے اس درجہ کو پہنچا ہے مگر یہ نہایت لغو عقیدہ ہے کہ ایک بیجان شے کو جاندار چیز کا موجد قرار دیا جائے۔ ایک مرتبہ جینیوں کے ایک جلسہ میں دکھایا گیا کہ انہوں نے دہی اور گوبر کو ملا کر بچھو پیدا کیے اور ثابت کیا کہ ایشور دنیا کا پیدا کرنے والا نہیں بلکہ جسطرح گوبر اور دہی مل کر بچھو پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح مادہ کے مختلف اجزا مل ملا کر مختلف اشیا پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اس مشاہدہ کو اس مجلس میں بہت سراہا گیا۔ مگر یہ نہ سوچا گیا کہ اس تجربہ و مشاہدہ کے پیچھے کوئی اور ہاتھ کام کر رہا ہے۔ دہی اور گوبر خود بخود ملنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ اور اگر یہی عمل حیرت انگیز ہے تو بتائیے کہ ذرا نم آلود جگہ پر چارپائیاں پڑی رہنے سے کھٹمل اور غلیظ رہنے سے جوئیں پیدا ہونا اور گلنے سڑنے والی اشیاء میں کیڑے پڑ جانا یہ مادہ کے کن مخلوط اجزا کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بقراط کے زمانہ سے یہ مشاہدات چلے آ رہے ہیں اور سائنس نے ہر چیز میں جراثیم کی موجودگی کو تسلیم کیا ہے۔ ہر روز نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں، مگر کیا آج تک کوئی نیا کیڑا، کوئی نیا جانور، کوئی نیا چوپایہ ان مختلف اجزا کی تخلیط سے پیدا کر کے اس میں جان ڈال دی گئی ہے۔ کوئی چرند یا پرند کسی نے پیدا کر کے اس میں روح پھونکی ہے۔ انسانی اجزا کا پورا علم ہوتے ہوئے بھی کسی نے کوئی انسان پیدا کیا۔ اسے بھی جانے دیجئے۔ کیا کسی نے بنے بنائے انسان سے روح نکل جانے کے بعد دوبارہ روح پھونکنے کی سعی کی اور چیزیں تو زمین پر نظر آتی ہیں اور مختلف اجزا ان کے ملتے جلتے بھی رہتے ہیں۔ یہ آفتاب و ماہتاب کیونکر پیدا ہو

گئے۔ اور کون کون سے مادوں کا مخلوط ہونا ان کی تخلیق کا باعث بنا اور ان میں یہ باقاعدگی کہ سورج لاکھوں برسوں سے مشرق سے ہی طلوع ہو رہا ہے۔ اور مغرب کو جاتا ہے۔ موسموں کا تغیر و تبدّل اپنے وقت پر شروع ہوتا ہے اور وقت پر ختم ہوتا ہے۔ خدائے قدوس جلّ و علا شانہٗ نے کس جامعیت کے ساتھ سمجھایا ہے کہ کیا یہ لوگ آپ ہی آپ پیدا ہو گئے ہیں۔ یہی خود مخلوقات کو پیدا کرنے والے ہیں اور انہوں نے ہی آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کچھ بھی نہیں اور نہ اتنی کسی کی مجال ہے۔

پس اس سے ظاہر ہوگا کہ خداوندِ عالم اور اسکی ذات پر اعتقاد محض نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی حیثیت تمام تر عملی ہے۔ اسی لیے اسلام نے توحیدِ الٰہی کو بڑے اعلیٰ اور بلند مقام پر پیش کیا ہے اور اسلام کی تعلیم میں سب سے ممتاز خصوصیت یہی ہے کہ اس نے توحیدِ خالص کا مسئلہ دنیا میں رائج کیا۔ اور خداشناسی کی غرض کو سمجھایا۔ اسلام سے پہلے اور اب بھی کافر و مشرک اور یہود و نصاریٰ وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل تو ہیں اور اسی کو نظامِ عالم کا خالق و مدبّر مانتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کی صفات میں دوسروں کو شریک کرنا بھی ان کا عقیدۂ خصوصی ہے۔ اسلام نے دنیا میں آکر اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کیا۔ کہ خدائے قدوس کی ذات و صفات میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔ توحید کی اس سادہ اور عام فہم تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ ریگستانِ عرب کے رہنے والے دنیا کے ہادی اور رہنما بن گئے۔ اور اسی تعلیم نے ان کو ظلمتِ کفر سے نکال کر نورِ ایمان سے منوّر کر دیا۔ توحید کی آواز جس فطرتِ سلیمہ رکھنے والے انسان کے کان میں پڑی وہی لبیک کہہ اٹھا اور اس خالص توحید کا جذبہ دلِ صافی میں موجزن ہو کر کفر و شرک کی غلاظتیں ایسی دھو گیا کہ اس میں مادی طاقتوں، غیر اللہ کی قوتوں، راہِ ترقی کی رکاوٹوں اور شیطانی وسوسوں کا یک قلم قلع قمع ہو گیا۔

یہاں توحیدِ الٰہی کے ذکر کو کچھ اور وضاحت سے سمجھ لیجئے کہ جس واحد مقصد کے لیے اسلام دنیا میں آیا اور جو اعتقادِ توحید اس نے دلوں میں راسخ کیا۔ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لینے کے بعد انسانی زندگی پر اس کا کیا اثر ہوا۔ ایمان لانے والے سلیم الفطرت انسان تنگ نظری سے چھوٹ گئے اور زمین و آسمان کے خالق کا قائل ہو کر ساری کائنات میں کوئی چیز اس کو غیر نظر نہ آئی۔ سب کو اپنی ذات کی طرح ایک ہی مالک کی ملکیت اور ایک ہی شہنشاہ کی رعیت سمجھنے لگا۔ اور اسکی ہمدردی اور محبت کسی دائرے کی پابند نہ رہی۔

پھر توحیدِ الٰہی کے اسی اقرار لا الٰہ الا اللہ نے انسان کو انتہائی خود داری اور عزّت کا مالک بھی بنادیا اور سوائے خدائے واحد کے وہ تمام قوتوں اور طاقتوں کے خوف سے بے نیاز ہو گیا۔ اس کی گردن کسی مخلوق کے آگے جھکنے سے محفوظ ہوگئی۔ اس کا ہاتھ کسی غیر کے آگے پھیلنے سے بچ گیا۔ اور اُس کے دل میں کسی کے تقدس کا رعب نہ رہا۔ اس لیے کہ وہ تمام قوتوں کا مالک ایک خدا کا پرستار بن چکا تھا۔

کلمۂ لا الٰہ الا اللہ نے جہاں موحد انسان کو خود داری سکھائی وہاں اس میں انکساری بھی پیدا کر دی۔ کیونکہ اس کلمہ کا قائل مغرور و متکبّر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے۔ اور جس طرح وہ عطا فرمانے پر قادر ہے ویسے ہی چھین لینے پر بھی قادر ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور نیک عمل کے سوا فلاح و نجات کا کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر اعتقاد رکھتا ہے جو بے نیاز ہے اور اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں۔ وہ بے لاگ عدل کرنے والا ہے جس کی خدائی میں کسی کو دخل کا یارا نہیں۔ یہ نورِ حقیقت عقیدۂ توحید کے سوا اور کسی عقیدہ سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ پرستارِ الٰہی کسی حال میں بھی مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو کائنات کے تمام خزانوں کا واحد مالک ہے۔ جس کی قوتیں بے پناہ ہیں اور جس کا فضل و کرم بے حد و حساب ہے۔ یہی اعتقاد اولوالعزمی بخشتا ہے اور صبر و توکّل کی زبردست طاقت بھی پیدا کر دیتا ہے اور اس عقیدہ کا حامل انسان جب خداوندِ عالم کی خوشنودی کے لیے کوئی بڑے سے بڑا کام انجام دینے کو اٹھتا ہے تو اس کے دل میں یہ یقین ہوتا ہے کہ میری پشت پر زمین و آسمان کے بادشاہ کا ہاتھ ہے۔ پھر اس کی دلجمعی اور بہادری کی انتہا نہیں رہتی۔ اور بزدلی کا تخیّل بھی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔ اس کے اعتقاد میں خداوندِ عالم کے قانون کی پابندی ایک بلند ترین حقیقت سمجھی جاتی ہے۔ اور وہ ہر ظاہر اور پوشیدہ گناہ سے بچنے کی اس لیے سعی کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ میرا لا الٰہ الا اللہ میری شاہ رگ سے بھی قریب ہے۔ اگر میں رات کی تاریکیوں اور تنہائی کے گوشوں میں بھی کوئی گناہ کروں گا تو خداوندِ عالم کو اس کا علم ہو جائے گا۔ اگر میرے دل کی گہرائی میں

بھی کوئی بُرا ارادہ پوشیدہ ہوگا تو عالم الغیب کو اس کی خبر پہنچ جائے گی۔ میں اپنی معصیت کاریاں سب سے چھپا سکوں گا۔ مگر میرے مولا سے کچھ نہیں چھپ سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کے لیے مسلمان کہلانے سے قبل لا الہ الا اللہ پر ایمان لانا پہلی شرط ہے۔ پھر ایسا عقیدہ جو تنہا ہماری ملت کا اساس ہی نہ ہو بلکہ ہمارے عمل کی بھی بنیاد ہو۔ اس خلّاقِ عالم اور علّام الغیوب پہ ایمان کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔



ہستئ باری تعالیٰ پر استدلال

کیا خداوندِ عالم کی کوئی ہستی ہے یا ماننے والے محض وہم کے پنجے میں گرفتار ہیں؟ اس سوال کا جواب صرف یہ ہے کہ جو لوگ اس معمورۂ دنیا میں آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے گردوپیش کے واقعات کو بغور دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی عقل کی بنا پر مجبور ہیں کہ اس ہر لحظہ بدلنے والی دنیا کی تہہ میں جو قوت کارفرما ہے اس کا کھوج لگائیں پھر "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" کا مصداق ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق اپنے دل کو تسکین اور تسلی دینے کے واسطے اور ایسے پیچیدہ سوالوں کے حل کرنے کے لیے کسی نہ کسی چیز کو اس دنیا کی علت قرار دیتا ہے۔ کسی نے مادہ کو ازلی و ابدی مانا اور علت قرار دیا۔ کسی نے روح کو، کسی نے عقل کو، کسی نے نفس کو، کسی نے ماوراء العقل ذاتِ مطلق کو، کسی نے عناصر کو۔ کسی نے افلاک کو۔ کسی نے آفاق کو، کسی نے حرکت کو، کسی نے دہر کو، کسی نے انسان کو، کسی نے اجرامِ فلکی کو، کسی نے کسی پوشیدہ طاقت کو۔ الغرض کسی نے یہ کہا کہ ضرور کوئی ہستی ہے جو ہمیں نظر نہیں آتی۔ کسی نے کہا ہمیں اس کا علم نہیں اور نہ ہم اس کو پا سکتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اس دنیا کی بنانے والی سنبھالنے والی اور قائم رکھنے والی جو ہستی ہے وہ صاحبِ شعور ہے خود مختار ہے۔ ازلی و ابدی ہے۔ غیر محدود طاقتوں اور خوبیوں کی مالک ہے۔ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ حاکم و شہنشاہ ہے اور اسی کو عرفِ عام میں خدا کہتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ مانے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اگر کوئی ایسی ہستی کو چھوڑ دے گا تو کسی غیر کو مانیگا، ورنہ حیوانوں کی طرح انسانی شرافت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ دنیا اور اس کے عجائبات و بوقلمونی مناظر کو دیکھکر خواہ مخواہ یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کچھ تو ہے جو ہر شخص کچھ نہ کچھ ماننے پر مجبور ہے اور لطف یہ ہے کہ ایسی حقیقت کا انکشاف کچھ نہ کچھ مانے بغیر ہو بھی نہیں سکتا۔ پھر یہ دنیا کیا ہے۔ آسمان و زمین کیا ہیں۔ چاند سورج ستارے

کیوں گردش میں ہیں۔ موسموں کی تبدیلی کیوں ہوتی ہے؟ یہ جہان کہاں سے آیا؟ کیوں بنا؟ کب بنا؟ کس نے بنایا؟ ہم کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔ کدھر کو جا رہے ہیں؟ روح کیا ہے؟ جسم سے کیسے مل گئی ہے۔ اس قسم کے ہزاروں سوالات ہیں جو ہر شخص کے ذہن میں آتے ہیں اور وہ ان کے جوابات میں کچھ نہ کچھ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مصنوعاتِ عالم پر ایک نظر ڈالنے سے ان کی صنعت کاری کے صحت وسقم سے فوراً ان کے بنانے والے کی قابلیت و عدم قابلیت کی طرف خیال منتقل ہو جائے گا۔ روضہ ممتاز محل کی نزاکت و خوشنمائی کو دیکھ کر شاہ جہان اور اس کے معماروں کی لیاقت پر ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ گراموفون کو دیکھ کر اڈیسن کے دماغ کی داد دینی پڑتی ہے۔ ریڈیو پر نگاہ پڑتے ہی اس کے موجد کی عقل وخرد کو سراہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک کھیت اور ایک باغ کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا بوتے اور لگانے والا کوئی ہے۔ بلند و بالا مسجدوں اور ان کے سرِ بفلک میناروں کے قریب جاتے ہی ان کے تعمیر کنندگان کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مگر کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اس گلشنِ عالم کا بنانے والا کسی کو تسلیم نہ کیا جائے۔ ہر صنعت کو دیکھ کر فوراً خیال اسکے صانع کی طرف منتقل ہو، لیکن چمکتے ہوئے تارے، نورانی چاند، ضیا بار سورج، بلند و بالا پہاڑ، سروں پر چھائے ہوئے آسمان، پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی زمین، رنگ برنگ کے پھول، مختلف الاقسام حیوان اور خود صاحبِ عقل وخرد انسان کو دیکھ کر ان کے صانع اور پیدا کرنے والے سے انکار کیا جائے۔ بریں فہم و دانش بباید گریست یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خود بخود مادہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ کہاں تک ہوشمندی کی دلیل ہے۔ کیا یہ انتہائی کج فہمی اور بدبختی نہیں کہ جزئیات و فرعیات میں تو صانع کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور کلیات میں انکار کی صورت اختیار کر لی جائے۔ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کو خلقت کے متعلق شبہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہ یہ کس کی پیدا کی ہوئی ہے۔ سو ان سے فرما دیجئے کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا تنہا اللہ ہے۔ جو سب پر غالب اور سب سے قوی ہے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ قرآن ایسے لوگوں کو غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے کہ وہ خالق کی نشانیوں اور دلائل کی طرف بھی متوجہ ہوں۔ ان کی فہم کے لیے ہماری ایک نشانی رات بھی ہے۔ کہ ہم اس سے دن کو نکال لیتے ہیں۔ تو ان پر تاریکی مسلط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری نشانی آفتاب ہے جس کا ایک قاعدہ کے ماتحت طلوع و غروب ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ زبردست اور ہر چیز سے واقف خدا ہی

کا مقرر فرمایا ہوا ہے۔ پھر ایک اور نشانی ماہتاب ہے کہ ہم نے اسکی منازل مقرر فرما دی ہیں اور آخر میں وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح باریک اور ٹیڑھا ہو کر رہ جاتا ہے۔ نہ آفتاب میں یہ قدرت ہے۔ کہ وہ اپنی رفتار سے بڑھ کر ماہتاب کو پکڑ لے۔ اور نہ دن کے پورا ہونے سے پیشتر رات ہی دن پر مسلط ہو سکتی ہے۔ سب کے سب اپنے اپنے دائرے میں پڑے گردش کر رہے ہیں۔ چونکہ انسان کائنات کی ہر چیز کو منظم دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے اعجاز قرآنی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نظامِ عالم کا یہ باقاعدہ اور منظم کارخانہ اللہ ہی نے قائم کیا ہے۔ اور اللہ ہی نے عالمِ اسباب کی ہر ہستی کو یہ ترتیب اور موزونیت بخشی ہے۔ اور انسانی ذہن کو اس کارخانہ کی جانب متوجہ کیا ہے۔ جس کے اندر غیر محدود زمانہ سے پوری باقاعدگی اور نظم و نسق چلا آتا ہے۔ اور جس کے صحیح انتظام پر دنیا کی شادابی اور فلاح کا انحصار ہے اور اس سب پر انسان کا ذرہ بھر بھی اختیار نہیں۔ گویا ان دلائل و حقائق میں واضح یہ کیا جا رہا ہے کہ اتنی پابندی اور باقاعدگی سے جو نظامِ کائنات قائم ہے۔ اس سے اہلِ عقل کو ہستئ باری تعالےٰ کا ثبوت کیوں نہیں ملتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ بغیر دیکھے بھالے خدا پر ایمان رکھنا کیا اصول ہے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ کائنات کی گتھی کو سلجھانے کے لیے جتنے حل پیش کئے جاتے ہیں ان میں سے سب سے لابدی ایک حل خداوندِ عالم پر اعتقاد رکھنا بھی ہے اور چونکہ یہ حل عقلی طور پر سب سے زیادہ تسلی بخش بھی ہے۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدائے کائنات ہے اور ضرور ہے۔ اور جو کوئی خدا پر ایمان رکھتا ہے وہ بلا وجہ نہیں بلکہ خداوندِ عالم کو ماننا اور اس پر اعتقاد رکھنا مندرجہ ذیل چند وجوہات پر مبنی ہے:۔

ا۔ اگر بغیر آنکھوں سے دیکھے یا خدا پر ایمان بالغیب رکھے اصول و عقل کے منافی ہے تو معترض یہ بتائے کہ اسنے مادے یا ایتھر کو کب آنکھ سے دیکھا ہے۔ اور نفس اور قوت کب اس کے دیکھنے میں آئے ہیں۔ مادہ جو خود بے شعور جنس ہے اس سے ذی شعور انسان کیونکر پیدا ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ تمام کائنات کا خالق مادہ نہیں بلکہ کوئی اور ذات ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ جہان میں مظاہر مختلفہ نظر آ رہے ہیں ان کی تہ میں ان سب سے بالاتر کوئی اور ہستی بلا شرکت غیرے کارفرما ہے اور وہی لاشریک خدا ہے۔ ایک بہت بڑے سائنسدان سے جب مسائلِ کائنات کی گتھی نہ سلجھ سکی تو مجبور ہو کر کہنے

لگا کہ ہماری اس زندگی کی مختلف شکلیں کس طرح صفحۂ ہستی پر جلوہ گر ہوئیں۔ ہاں اتنا پتہ چلتا ہے کہ زندگی، زندگی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ بے جان مادے سے جاندار ظہور میں نہیں آسکتا۔ اور بے شعور ذات سے باشعور انسان نہیں بن سکتا۔

سائنس کا کام تو صرف حقائق سے بحث کرنا ہے نہ کہ حقائق کا راز اور ان کی ماہیت معلوم کرنا سائنس نے اسقدر پتہ چلالیا کہ کائنات چند قوانین کے ماتحت چل رہی ہے اور غور و فکر کے بعد ان قوانین کے نام بھی رکھ لیے۔ مگر قوانین چلانے والے کا نام نہیں رکھ سکے اور یہ نہیں سمجھ سکے کہ قانون کا وجود بغیر کسی قانون گر کے نہیں ہوسکتا۔ مسٹر بالفور جو ایک زبردست سیاست اور سائنسدان ہیں۔ لکھتے ہیں کہ بے شعور ذرات نے کس طرح ان دو صفات یعنی علم و دانش کو پیدا کیا ہے جبکہ وہ خود ان سے کورے اور خالی ہیں۔ اور کیا صرف مادہ نے ارسطو اور افلاطون پیدا کر دیے تھے؛ جنہوں نے خود مادے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ ہنری برگسان مشہور فرانسیسی فلسفی کا قول ہے کہ اس دنیا میں جو عمل ہر وقت جاری وساری ہے وہ زبانِ حال سے شہادت دیتا ہے۔ کہ پسِ پردہ کوئی علیم و حکیم ہستی موجود ہے۔ اگر ایک جہاز بغیر ناخدا کے نہیں چل سکتا تو اس کائنات کا جہاز بغیر خدا کے کیسے چل سکتا ہے۔

۲۔ اس اعتقاد کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ خداوندِ عالم پر ایمان رکھا جائے۔ کیونکہ ہر ذہنیت میں دوسرے کا سہارا تلاش کرنے کی حس موجود ہے۔ اور ہر زندگی نہ مختار ہے نہ آزاد ہے۔ اور نہ ہی مالک ہے بلکہ ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوئے کسی آستانہ پر جبین سائی کرنے کا جذبہ بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ اور وہ فی الحقیقت کسی بیرونی ہستی سے مطابقت رکھتی ہے۔

۳۔ پھر اس اعتقاد کی تیسری وجہ خود انسانی ضمیر کی آواز ہے کہ یہ قوت یا صفت اپنی پیدا کردہ نہیں اور نہ دنیا میں کوئی شخص ایسا ہوا ہے۔ جس نے اس مقدس آواز کو سنا نہ ہو۔ ہاں جب اس مقدس آواز پر دھیان نہیں دیا جاتا تو یہ آواز اس قدر مدھم پڑ جاتی ہے کہ سنائی نہیں دیتی۔ لیکن

کوئی شخص اس سے ضمیر کی مقدس آواز کی عدمیت ثابت نہیں کر سکتا۔ جب انسان تنہائی میں کوئی کام ایسا کرنے لگتا ہے۔ جو ضمیر کی آواز پیدا کرنے والے کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ تو فوراً یہ آواز انسان کو چونکا کر متنبہ کرتی ہے کہ یہ کام بُرا ہے مت کرو۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اس آواز کو سُن کر انسان اس پر عمل کرے یا نہ کرے پس اگر واقعی کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی مرضی کے خلاف وہ کام ہوتا ہے۔ تو پھر یہ آواز کیسی اور اس کی آگاہی کا کیا مطلب۔ کیونکہ مادہ تو بے شعور ہے۔ اس کو نیکی اور بدی سے کیا سروکار۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس ضمیر کی آواز پر غور کیا جائے۔ تو یہ تعلیم و تہذیب کا نتیجہ ثابت ہوتی ہے یہ وہ شان نہیں رکھتی جس کو کچھ کا کچھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر ان کو یہ پتہ نہیں کہ یہ آواز ابتدائے آفرینش سے موجود ہے۔ ان کے کالجوں اور انسان سے حیوان بنانے والی تعلیم کا ثمرہ نہیں۔ اگر وہ افریقہ، جنوبی امریکہ اور آسٹریلیا کے وحشیوں میں چلے جائیں جو آج بھی پرانی تاریکی میں مبتلا ہیں۔ تو معلوم ہو جائیگا کہ ضمیر کی آواز وہ بھی سنتے ہیں۔ خدا کا اعتقاد محض کسی مہذّب ملک اور قوم سے وابستہ نہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری اور نہ آج موجود ہے جس کے اعتقادات میں کسی نہ کسی طرح خدائے حقیقی کا تصوّر موجود نہ ہو۔ جو لوگ ساری عمر خدا کی ہستی کے خلاف لیکچر دیتے رہے ہیں۔ مرتے وقت وہ بھی ضمیر کی گرفت سے نہیں بچ سکے۔ چنانچہ امریکہ کا ایک مشہور منکرِ خدا (انگرسال) اپنی موت کے وقت گڑگڑا کر یوں گویا ہُوا کہ اے خدا اگر تو ہے تو میری روح کو تسکین عطا فرما۔

۴۔ اس اعتقاد کی چوتھی وجہ وہ شہادت ہے جو دنیا کے تمام عقلاء، فضلاء، حکماء اور انبیاء علیہم السلام نے خدا پر دی ہے۔ کیونکہ تمام دنیا جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتی اور نہ عقلاء، حکماء، فضلاء، رہنما اور انبیاء علیہم السلام بے وقوفوں کی ہمنوائی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی مجموعی و بالائی طاقت (جس کو خدا کہنا بالکل درست ہے) نہیں ہے اور نہ تھی تو ان کی تمام پیشینگوئیاں کس طرح پوری ہوئیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کائنات ہے اور ضرور ہے۔

۵۔ پانچویں وجہ اس اعتقاد کی یہ ہے کہ ہر اہلِ عقل کے نزدیک کوئی قانون بغیر قانون گر کے اور

کوئی صنعت بغیر صانع کے رونما نہیں ہوسکتی۔ جس طرح کوئی ملحد اس بات کا جواب نہیں دے سکتا کہ بے شعور مادہ سے باشعور انسان کیسے بن گیا۔ اس طرح کوئی منکرِ خدا اس بات کا بھی جواب نہیں دیسکتا کہ معمولی مادہ کے ذرّات میں مختلف خواص کہاں سے آگئے اور وہی مادہ غیر شعوری طور پر کان میں سننے لگا اور آنکھ سے دیکھنے لگا اور اگر اتفاق سے ایسا ہوتا ہے تو وہ کوئی ایسا آدمی پیش کریں جو آنکھوں سے سنتا ہو۔ اور کانوں سے دیکھتا ہو۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ کسی علیم وحکیم ہستی نے ایک مقصد کے ماتحت انسان کو پیدا فرمایا ہے اور اس کی ساخت بھی ایک مقصد کے ماتحت ہی عمل میں آئی ہے۔ اور ایسا حقیقی مقصد ایک ذی شعور ہستی ہی ظاہر فرما سکتی ہے اور وہ خالق الکل خدا ہے۔

غرضیکہ ہر مخلوق کی پیدائش صنعت وحکمت کا وہ پورا نمونہ ہے جو پکار پکار کر انسان کو ہستی باری تعالےٰ کی بارگاہ میں جھکا رہا ہے اور ان صنائع کو پیش کر کے تسلیم کرا رہا ہے کہ کوئی مدبر بالارادہ ہستی ہے جس کی صنعت کے یہ تمام شواہد ہیں۔

مزید برآں آگ میں جلانے، پانی میں ڈبونے، زہر میں ہلاک کرنے، شورہ میں پیشاب لانے، افیون میں قابض ہونے حنظل یا جمالگوٹہ میں اسہال لانے کی جو خاصیتیں رکھ دی گئی ہیں۔ وہ قیامت تک اسی نوعیت و حقیقت پر قائم رہیں گی۔ اگر ان اشیاء کے خواص میں دوامی رنگ نہ ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی ایجاد نہ ہوسکتی جن کو علم الادویہ میں دخل ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ بیش بہا بوٹیاں جو جنگلوں، ویرانوں اور کھنڈروں میں اُگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان میں وہ کامل تاثیرات ودیعت ہیں جو زیادہ نہیں تو کچھ دیر کے لیے انسان کو محو حیرت بنا دیتی ہیں۔ اور زبان سے بے ساختہ صانع کی صنعت کا اقرار کرنا پڑ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی چیز فضول اور عبث پیدا نہیں فرمائی۔ جن کے اثرات دیکھ کر بڑے سے بڑا منکر بھی سرِ نیاز جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ڈاروِن نے محض مادہ ہی پر غور کیا تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ہندوؤں، بدھوں اور چینیوں کے سادھوؤں میں جڑی بوٹیوں کے حیرت انگیز اثرات جاننے والے بکثرت موجود ہیں لیکن پھر بھی غور نہیں کرتے کہ ان بنزلوں

ہیں یہ خواص کیونکر پیدا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ زمین ایک ہے۔ پانی ایک ہے، آفتاب و ماہتاب اور موسم کے اثرات بھی ایک ہیں۔ پھر یہ کیا وجہ ہے کہ ہر بوٹی مختلف رنگ و بو، مختلف ذائقہ اور مختلف تاثیرات کی حامل ہے حنظل اور تربوز پر اگر مادہ کا اثر ہوتا تو یکساں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتاً اس اختلاف تاثیر اور فرق ذائقہ کو پیدا فرمانے والا وہی فاطر السموٰت والارض ہے جس نے انکو مختلف اغراض و امراض کیلئے پیدا فرمایا ہے اور وہی خدائے کائنات ہے۔

مور کی دُم کے چاند ستارے یا نقش و نگار، مرغابی کے پروں کی نقاشی، زیبرے کی پشت کے قالین نما خط و خال، شیر اور چیتے کی کھال کے دھاریدار اور گول داغ غور کرنے سے یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ گوناگوں رنگ آمیزی اور ترتیب ساخت جو ایک عام نمونے کو تکمیل پر پہنچانے کا کام دیتی ہے اس کے اجزا آپ سے آپ مل کر کیوں کر خاص دلکش مرقع بن سکتے ہیں۔ مادہ پرستوں کا راہنما لارڈ کلون بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتا ہے اور لکھتا ہے میں اسکو نہیں مانتا کہ سائنس ایک خالق کی ہستی کے بارے میں ہاں یا نہ کچھ بھی نہیں کہتی بلکہ سائنس صریحاً تسلیم کرتی ہے کہ ایک پیدا کرنے والی غائبی اور مجموعی طاقت ہے۔ جس کو مذہبی اصطلاح میں اللہ کہتے ہیں اور سائنس یہ ماننے پر بھی مجبور ہے کہ ایک طاقت ہے جو سب کی خالق، راہنما اور ناظم ہے اور یہ صرف اعتقاداً ہی تسلیم نہیں کرایا۔ بلکہ ایسا قاعدہ کلیہ پیش کیا ہے جس پر ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ زمانہ حال کے عالمان علم حیات پھر ایک دفعہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ کوئی ہستی نامعلوم یا غائب ہے جو زندگی بخشنے والی طاقت کہلا سکتی ہے۔ وہ ایک ایسی عالم و ناظم ہستی پر ایمان لا رہے ہیں جو مادی نہیں بلکہ ایک غائب طاقت، نور اور راز اور محیط الکل ہے۔ کلون نے ایک ماہر الکیمیا سے سوال کیا کہ کیا آپ کا خیال ہے۔ کہ یہ گھاس اور پھول پتے محض کیمیاوی تحلیل سے خود بخود زمین سے نکل آتے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ جسطرح میں جانتا ہوں کہ علم نباتات کی کتابیں آپ ہی آپ صرف قوت کیمیاوی سے وجود میں نہیں آ گئیں اسی طرح کائنات بھی خود بخود پیدا نہیں ہوئی۔

حکیم لقمان بھی خداوند عالم کی ہستی پر یہی دلیل لایا کرتا تھا کہ فرض کیا سب چیزیں مادہ سے بنی ہیں۔ مگر مادہ خود کیونکر بنا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس نے آپ اپنے تئیں بنا لیا ہو جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ مادہ کا کوئی اور خالق ہے اور وہ بڑا دانشمند بھی ہے ورنہ جو خود عقل سے خالی ہو وہ انسان جیسی دانشمند مخلوق کیونکر پیدا

کرسکتا ہے۔ پھر یہ ایک اور امرِ محال ہے کہ کائنات بایں ہمہ گی خود بخود پیدا ہو گئی ہو۔

پس کسی کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ ہم ایمان ہی کی قوت سے خلافِ قیاس اور بعید از عقل مقاصد کو بھی پا لیتے ہیں اور ایمان ہی کی قوت سے خارقِ عادت حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں اور ان ہونی باتیں بھی ہو جاتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا ہے جو فلسفیوں سے پوشیدہ رہا ہے اور ہمیشہ رہیگا مگر ایمان والے دلق پوش اس کے رازدار اور عارف بن جاتے ہیں۔ جن کی قوتِ ایمانی محبوب و محب کے درمیان واسطہ ہو جاتی ہے اور اسی قوت کا ایک ذرہ فلسفہ کے ہزار دفتر سے بہتر سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ صرف موجبِ نجات ہی نہیں بلکہ دنیا کی مصائب اور لعنتوں سے بھی چھڑا دینے والی ہے۔ روح کے تحلیل کرنے والے غموں سے یہی قوت نجات دلاتی ہے اور اسی سے کرب و الم کی گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے کہ عقل کا ایک نور ہے اور ایمان کے بہت انوار ہیں اور باطنی آنکھیں ظاہری آنکھوں کے لیے موّید ہوتی ہیں۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے ہستئ باری تعالیٰ پر جس طریق سے استدلال فرمایا ہے وہ ایسا سیدھا، صاف اور واضح ہے کہ ہر عالم و جاہل اور ہر عاقل و بیوقوف کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ اس کا یہ طریق علم بصیرت کے لیے سودمند اور ہر قسم کے نظر و استدلال کے الجھاؤ سے پاک ہے۔ وہ مجرد ذہن و ادراک سے نہیں بلکہ وجدان سے خطاب کرتا ہے اور ایمان و یقین عام نظری استدلال سے نہیں بلکہ صرف وجدانی شہادت کے ذریعہ حاصل کراتا ہے۔ وہ وجدانی شہادت جو فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:-

۱۔ کیا خدا کی نسبت بھی شک ہو سکتا ہے جو آسمان و زمین کا موجد ہے یعنی فاطر السموات والارض نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ اس کو نخواہ مخواہ خداوندِ عالم کی ہستی کا قائل ہونا پڑتا ہے اور وہ اپنے آپ کو خدا کے وجود کے اعتراف پر مجبور پاتا ہے۔

۲۔ ہم نے تم کو پیدا فرمایا ہے اور تم ہی تصدیق نہیں کرتے۔ کیا تم اس بات کو نہیں دیکھتے کہ تم منی ڈالتے ہو تو پھر کیا تم اس کو تخلیق کرتے ہو یا ہم۔

۳۔ کیا تم کھیتی کو نہیں دیکھتے کہ تم بیج تو ڈالتے ہو، تو تم اس کی مزارعت کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں۔

(۴) کیا تم نے پانی کو نہیں دیکھا جو پیتے ہو۔ کیا تم نے اس کو اتارا ہے یا ہم اس کو اتارنے والے ہیں؟

(۵) کیا تم آگ پر نظر نہیں کرتے جو روشن کرتے ہو؟ کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم نے؟

الغرض ایک ادنیٰ فہم وادراک کا آدمی ان امور کی محکم ترتیب اور خلق و رزق کی عجیب و غریب قدرت کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ عالم انسانیت کے لیے یہ چیزیں بغیر کسی صانع کے وجود میں آگئی ہیں۔ بلکہ ہر شخص وجود صانع کے اعتراف پر مجبور ہے کیونکہ ہر ایک عقلمندی اور حسن تدبیر کا کام ایک عالم صانع ہی کی دستکاری پر دلالت کرتا ہے۔ گویا حکیم و علیم خدائے کائنات نے مادہ پرستوں کو بھی تصدیق کرا دی ہے کہ وہ اپنی لغو تحقیقات سے ہاتھ اٹھائیں اور اس کی ہستی کا اقرار کریں۔



ممانعتِ شرک

قرآنِ کریم میں لفظِ شرک بیشتر مقامات پر صفاتِ خالقیت و ربوبیت میں کسی کو شریک ٹھہرانے کے مواقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا قرآنی اصطلاح میں شرک ہے۔ یعنی حق تعالیٰ جل وعلا شانہ، کے لیے مخلوق کی چیزیں نہیں اور مخلوق کے لیے حق تعالیٰ کی چیزیں اصالۃً نہیں پائی جاتیں۔ اگر ہم خلق کی چیزیں حق تعالیٰ جل مجدہٗ کے لیے ثابت کریں تو کفر لازم آتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی چیزیں مخلوق کیلئے ثابت کریں تو شرک ہو جاتا ہے گویا خداوندِ عالم کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک کرنا یا اس کی عبادت میں شریکِ الوہیت گردانا شرک کہلائے گا۔

کسی گذشتہ بحث میں یہ مذکور ہوا ہے کہ ذہنِ انسانی کی افتادہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ وہ ماورائے سرحدِ ادراک کو بھی کھینچ تان کر محسوسات کے دائرہ میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کی چشمِ نظارہ جو حقیقتِ مستور کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کی اس قدر متمنی ہے کہ وہ اس تصور کے بغیر اپنی جبینِ نیاز کے بیتاب سجدوں کو بھی اذنِ نقوش آرائی نہیں دیتی۔ مولا کریم نے ان انسانوں کو جو اپنی صفاتِ لم یزلی سے متعارف کیا تو لامحالہ زبان بھی انسانوں ہی کی استعمال میں آئی۔ اس لیے کہ خداوندِ عالم اور انسانوں کے درمیان اور کوئی ذریعہ فہم وتفہیم نہیں ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محسوسات کا خوگر ذہنِ انسانی فوراً منتقل ہو گیا۔ اور تنزیہہ وتجسیم کی نامتناہی بحثیں معرضِ وجود میں آگئیں۔ اور لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ کی حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو مالک الملک فرما کر ارض وسموات کی بادشاہت کو جو صرف اپنے لیے مخصوص فرمایا تو انسانی ذہن نے اللہ تعالیٰ کا تصور ایک مطلق العنان خود مختار بادشاہ کا سامنے لا کھڑا کیا اور اسکی سطوت وعظمت اور شوکت وجبروت کو بھی کچھ ایسا رنگ دیا۔ کہ

اللہ تعالیٰ نے جو من دون اللہ کی غلامی سے منع فرمایا۔ اس کا بھی یہی مطلب لیا گیا کہ دنیوی بادشاہوں کی طرح وہ ذات ایزد متعال بھی یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کا نام لینے والا کسی اور کا خیال بھی دل میں لائے۔ حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی قوت کا راز اس جماعت کے قوتِ بازو میں مضمر ہوتا ہے جو اس کو اپنا بادشاہ سمجھتی ہے اور اسکی سلطنت کی فنا و بقا کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے اور اس جماعت کی قلت و کثرت پر اس لیے اس بادشاہ کو ہر وقت یہ خیال دامنگیر رہتا ہے کہ اسکی رعایا کے دماغ میں کسی دوسرے بادشاہ کا خیال نہ آجائے۔ لیکن اس کے برخلاف اس مالکِ حقیقی کی حکومت و سطوت انسانی دست و بازو کی رہینِ منت نہیں۔ کیونکہ اگر تمام دنیا کے انسان اس کی درگاہِ صمدیت میں اطاعت گزاری کے طوق گردنوں میں ڈال کر سرِ نیاز خم کردیں تو اس کی ازلی و ابدی شہنشاہیت و سلطنت میں ایک ذرہ کا بھی اضافہ نہیں ہوگا۔ اور اگر تمام دنیا کے اوندھی کھوپڑی والے انسان اس بارگاہِ بے نیاز سے سرکشی و تمرد کر کے راندۂ درگاہ ہو جائیں تو اسکی لازوال حکومت میں ایک ذرہ کی کمی نہیں ہوگی۔ اس کے ایوانِ سلطنت کی تزئین میں کسی قشقۂ جبین کی سرخی سے نہ کوئی رنگینی بڑھ سکتی ہے اور نہ سجود و نیاز کی قلت سے اس کے سنگِ آستاں کی درخشندگی میں کچھ فرق آسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس وقت بھی باایں ہمہ جبروت و سطوت مالکِ ملک تھا۔ جبکہ کوئی اس کا نام لینے والا مخلوق نہ ہوا تھا اور اس کی لازوال سلطنت اس وقت بھی اسی شان و شوکت سے باقی رہے گی۔ جبکہ اس کا کوئی پرستار باقی نہ رہے گا۔

رب العزت نے اگر انسانوں کو اپنی پرستش کا حکم دیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے اس کی قوت یا حکومت میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ محض اس لیے کہ اس میں خود انسانوں ہی کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اسلام نے تمام عبادات کی علت اسے ہی قرار دیا ہے کہ جس نے نیک عمل کیا تو اپنے لیے کیا اور اگر برا کام کریگا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ ہر انسان کو نعمتِ الٰہی پر شکر کا فائدہ اسی کی اپنی ذات کے لیے ہے۔ اور اگر اس نے ناشکری کی تو اس سے اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اس کی ناشکری سے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا گویا افعالِ جوارح یا اعمالِ قلب سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع یا نقصان مقصود نہیں۔ اس لیے کہ اسکی ارفع و اعلیٰ

ذات انسانی اعمال کے نتائج سے بے پرواہ ہے۔ دنیوی بادشاہوں کی طرح وہ انسانی عبادت گزاریوں کی محتاج نہیں یہی وجہ ہے کہ اس بے نیاز نے اپنے محبوب علیہ السّلام سے فرما دیا تھا کہ یہ لوگ احسان جتلاتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔ یہ ان کا احسان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر احسان بیان فرماتا ہے کہ اس نے ان کو ایمان کی طرف رہنمائی فرمائی اور اس کا یہ اقرار کریں گے۔ اگر یہ سچے ہیں۔

جب اسلام کے نزدیک تمام عبادات کی یہی علت ہے۔ تو عقیدۂ توحید جو فی الحقیقت قلب کی ایک اساسی عبادت ہے بھی اسی اصول پر مبنی ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ شرک اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا جرم ہے۔ جو ناقابلِ عفو فرمایا گیا ہے اور اسی بد اعتقادی کی وجہ سے عبد و معبود کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ دل و دماغ پر خوف و ہراس چھا جاتا ہے۔ انسانی شرف و کمال برباد ہو جاتا ہے اور اسی سے ذہنی اخلاقی اور روحانی تنزّل کی بُنیاد رکھی جاتی ہے۔ اقوام و افراد میں اجنبیت، حسد و بغض، تکبّر و نخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اخوتِ انسانی کی تمام عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے اور علمی صداقت ہے کہ صحیفۂ قدرت کے کل مظاہر قانونِ قدرت کی حکومت کے ماتحت ہیں اور مظاہر عالم و اشیاءِ عالم سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کو ان قوانین کا علم ہو۔ اور وہ اپنے حالات کو ان قوانین فطرت کے مطابق کرے۔ لیکن انسان کا یہ علم اور تسخیر اشیاء عالم کی استعداد کسی کام کی نہیں اگر انسان کا یہ ایمان اور عقیدہ ہو کہ اس کائنات کا حکمران اور مالک و خالق ایک نہیں بلکہ کئی ہیں۔ اس عقیدہ کی ممانعت مولا کریم نے خود فرما دی ہے۔ کہ اگر ایک معبودِ برحق کے سوا زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے تو فساد ہوتا۔ اس حقیقت کا راز ہمیں انسانی خلقت کے اندر ہی ملے گا۔ کیونکہ قرآنِ کریم نے تخلیق آدم کا مقصد ہی تفویضِ خلافت اور نیابتِ الٰہی قرار دیا ہے۔ تاکہ وہ تمام مخلوق ارضی و سماوی سے خدمت لے اور اس کائنات میں اپنے آقا و مولا کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت حکومت کرے اور زندگی گزارے۔

اب ظاہر ہے کہ انسان اگر اللہ تعالےٰ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نیاز جھکا کر اپنے تذلل و تعبد کا ثبوت دیگا تو وہ یا تو کوئی اسی کا ہم جنس ہوگا یا انسان کے سوا کوئی اور مخلوق اور جملہ مخلوقات کے متعلق تو

خالق حقیقی کا یہ ارشاد ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہ پیدا ہی اس لیے کی گئی ہیں کہ انسان ان سے خدمت لے تو جو چیزیں کسی کی خادم پیدا کی گئی ہوں ان کو مخدوم بنا لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اب رہے دوسرے انسان تو پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں پھر اپنے برابر ہی کے سامنے جھکنا اور سجدہ ریز ہونا انسانی خودداری اور شرافتِ اعلیٰ کے منافی نہیں تو کیا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انسانی عبودیت کے اظہار کے لیے اگر کوئی ہستی ہو سکتی ہے تو وہ تمام کائنات سے بلند و بالا، انسانوں سے ارفع و اعلیٰ، تمام مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانیوالی اور سبکو وجود سے عدم دکھلانے والی۔ نیست سے ہست اور ہست سے نیست کرنیوالی، صرف ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی ہو سکتی ہے۔ نہ کہ وہ جو خود اپنی ہی فنا و بقا میں دوسرے کی محتاج ہو۔

انسان فطرۃً خوددار واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر دنیا میں یہ اپنی خودداری بیچ کر ذلیل ہوتا ہے تو صرف دو چیزوں کے لیے۔ ایک جلبِ منفعت اور دوسرے دفعِ مضرت۔ اگر اسباب و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو انسانی خودداری کی شکست کے لیے یہی دو بھاری چٹانیں نظر آئیں گی۔ خوف و امید کی تاریخ کے صفحات الٹنے سے پتہ چلے گا کہ جہاں کہیں انسان نے انسان کے سامنے یا دوسری کسی مخلوق کے حضور میں سرِ نیاز جھکایا ہے۔ وہاں ان ہی دو مقناطیسی کششوں کی بدولت جھکایا ہے اور یہی وہ دو مہیب اور خوفناک غار ہیں۔ جن میں گرا ہوا یہ کچھار کا شیر روباہ مزاج بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اگر لغزش کے یہی دونوں مقام سطحِ ارض و سماء سے کہیں دور لے جا کر رکھ دیے جائیں تو پھر انسانی سرفرازیوں اور بلندیوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ بعض گمراہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کرتے ہیں جو ان کو کچھ بھی نفع و ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ انسان انسان کے برابر کا اور باقی مخلوق بمنشاءِ ایزدی اسی کی محکوم پھر کس میں طاقت ہے کہ رب العزت کے مقابلہ میں سلطنت بخش دے یا کچھ ضرر پہنچا سکے۔ یہی وہ چیز تھی جو معمارِ کعبہ اور توحید کے واعظِ اوّل سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب ان کی قوم نے کہا کہ تم ان بتوں کی توہین و تکذیب کرتے ہو جن کا جلال تمہیں گرفت میں لے سکتا ہے تو اس شناسائے حقیقت نے قوم سے بے خوف و خطر کہہ دیا کہ جن چیزوں کو تم خداوندِ عالم کا شریک ٹھہراتے ہو ان سے میں نہیں ڈر سکتا۔ حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کیا

ہے۔ جنکی شرکت کے لیے خالق الکل نے کوئی چیز نازل نہیں فرمائی۔ ڈرنا تو تم کو چاہیئے جو خدا کے ساتھ اوروں کو شریک بنا کر ایک ایک چیز سے خوفزدہ رہتے ہو۔ اگر تم میں عقل و شعور ہے تو خود ہی سوچو کہ ہم دونوں میں سے کون بےخوف کہلانے کا حقدار ہے۔ الغرض اقوامِ سابق کے حالات و معتقدات سامنے لائیے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ جن قوموں نے عناصر طبعی کو اپنا معبود اور خدا بنائے رکھا ہے وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکیں۔ اندر، اگنی، وائیو کے پجاریوں کو دیکھیئے تو کہیں بھی پیش پیش دکھائی نہیں دیں گے۔ ہندو مت میں تنتیس کروڑ دیوتاؤں کو خدا کا اوتار تو مان لیا گیا ہے۔ مگر ویدانت کی تعلیم کے مطابق تمام دنیا اور خدا کا ایک ہی وجود ہے اور عرفان کے میدان میں خداوندِ عالم اور کسی ادنیٰ ترین جانور میں امتیاز نہیں کیا گیا۔ اور درخت، پتھر، جانور، انسان سب کی پوجا کرنے میں باک نہیں سمجھا گیا۔ پھر اس مخلوقات سے آگے بڑھ کر جنہوں نے انسانوں کو اپنا معبود بنا لیا۔ ان کی ارواح بھی بلندی کی فضائے بسیط میں پر نہیں مار سکیں۔ پس قرآنی عقائد کا مفہوم یہی ہے کہ قلبِ مومن سے خوف و ہراس کے تمام مزعومہ خطرات دور ہو جائیں اور وہ ایک کا ہو کر جو (فی الحقیقت اس کا سزاوار ہے) تمام دنیا سے بے نیاز ہو جائے۔ قرآن کریم نے مومنوں کا خوف و حزن دور کرنے کے لیے افواج قاہرہ کا اجتماع اور بروج مشیدہ کی تعمیر ہی کو کافی نہیں سمجھا۔ کیونکہ یہ صرف مادی جسم کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس نے ان اسباب کو ثانوی چیز قرار دیا ہے۔ اور اولین ضرورت اس قلب کی حفاظت کی سمجھی ہے۔ جس کے بدل جانے سے ہر ایک چیز کا رنگ بدل جاتا ہے اور وہ جسکی بلندی ہر شئے کی بلندی اور جسکی پستی ہر شے کی بربادی کے مترادف ہے۔

اسلام نے دنیا سے جسمانی غلامی کی ہی زنجیروں کو نیست و نابود نہیں کیا بلکہ ذہنی غلامی کے طوق و سلاسل کو بھی کاٹ کر پھینک دیا۔ جن میں نسل انسانی مختلف النوع طریقوں سے گرفتار ہو کر اس فضیلت ازلی کو کھو بیٹھی تھی جو ان کے لیے مایۂ امتیاز قرار دی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے جس کی رگوں میں غلامی سرایت کر چکی تھی۔ دین و دنیا کی فلاح و صلاح کی دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہ نے ارشاد فرمایا کہ فلاح کا وعدہ تو یقینی ہے۔ بشرطیکہ آپ کی قوم اس نبی امی علیہ السلام کی پیروی کا اقرار کرے۔ جسکی بعثت مبارک کا مقصد وحید منجملہ دیگر مقاصد عالیہ ایک یہ ہے کہ وہ پاکیزہ چیزیں ان کے

لیے حلال کرے گا۔ اور ناپاک وخبائث سے ان کو منع فرمائے گا۔ اور وہ بوجھل زنجیریں جن میں یہ جکڑے ہوئے ہوں گے ان کو نجات دلائے گا۔

چنانچہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت یہود و نصاریٰ اسی مفلوج ذہنیت کے مریض تھے اور ان کے غلط کار احبار و رہبان نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے ان پر غلط عقائد کا وہ تسلط جما رکھا تھا۔ جس سے نجات حاصل کرنا تو درکنار قوت تمیز ہی پیدا نہ کر سکتے تھے۔

اسلام اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھا اور اس نے خالص توحیدِ الٰہی کا ایک ایسا بلند مطمح نظر قائم کیا کہ اس سے قبل دنیا کے کسی کونہ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے یہی نہیں کیا کہ کمزور انسانوں کو جابر اور زور آور انسانوں کی غلامی یا دوسری مخلوقات کی عبودیت سے ہی نجات دلائی بلکہ اس نے انسان کو اپنی خواہشات اور مرضی کا تابع بھی نہیں ہونے دیا۔ اور فرمایا کہ وہ انسان بھی گم کردہ راہ ہے جو اپنی نفسانی خواہشات کو خدا بنالیتا ہے۔ اللہ اکبر۔ کس قدر باریک ترین اور غیر مرئی وغیر محسوس نظریہ ہے کہ دوسروں کی ہوائے نفس کا اتباع تو درکنار اپنے ہی نفس کی خواہشات کا غلام بننا بھی شرک قرار دے دیا گیا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ اپنے تمام ارادوں اور خواہشوں کو قطعی طور پر اسی بزرگ ذات کی مرضی اور مشیت پر چھوڑ دو۔ جس کو خداوندِ کائنات ہونیکا بجا طور پر حق حاصل ہے۔ گویا بندۂ مومن کا جو قدم دنیا میں اٹھنا چاہیئے یا اس کے دل میں جو ارادہ پیدا ہو وہ کسی مخلوق یا کسی ہم جنس انسان حتیٰ کہ خود اپنے لیے بھی نہ ہو بلکہ وہ اسی خالق الکل خدا کے لیے ہو جس کا اپنے آپ کو یہ بندہ کہلاتا ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شرک دو طرح پر ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس کی دو قسمیں ہیں۔ ۱ شرک فی الذات ۲ شرک فی الصفات۔ شرک فی الذات یہ ہے کہ خداوند عالم جلّ و علا شانہٗ کی ذات میں کسی کو شریک گردانا یعنی بجائے ایک خدا کے کئی خدا مانتے جائیں اور شرک فی الصفات یہ ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی دوسری ہستی کو ان صفات سے ویسا ہی متصف مانا جائے۔ جو حقیقتاً خاصۂ خدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے دنیا میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ نسل انسانی کی اصلاح کے سب راستے چمکا دیے۔ اور انسانی دل و دماغ کو ایسے باطل خیالات و غلط معتقدات سے ایسا پاک و صاف

کر دیا کہ نسلِ انسانی کفر و شرک کی گندگی سے نکل کر برکات و حسنات کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی - آج وہ قومیں جو مادی ترقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں - اسی خوفناک غلطی کی وجہ سے کہ انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے - ایسے دردناک عذاب میں مبتلا ہیں کہ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی اطمینان قلب نصیب نہیں اور یہ عذاب الٰہی کی وہ آگ ہے جس کے شعلے ان کے دلوں کو لپٹے ہوئے ہیں -

یہ ہے وہ شرک جس سے اسلام نے بڑی شدّت سے منع فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی گناہ ہو بھی نہیں سکتا - قرآنِ کریم نے اس کے متعلق ایسے ٹھوس اور باوزن الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے - یعنی ارشاد ہوتا ہے کہ تحقیق شرک بہت بڑا ظلم ہے اور ظلم کے معنے ہیں کسی چیز کا بے محل اور بے جا استعمال - شرک کو ظلم اس لیے کہا ہے کہ انسانی تخلیق کا مقصد تو یہ تھا کہ انسان تمام موجودات عالم پر حکمرانی کرے اور ایک خدا کا نائب ہو کر اسکی مخلوق سے خدمت لے - مگر جو سر حکومت اور سرفرازی کے لیے بنایا گیا ہو اگر وہ محکوم اور خادم کے آگے جھکنے لگ جائے تو اس سے بڑھ کر اس کا بیجا استعمال اور کیا ہو سکیگا - گویا شرک سے اجتناب کا مقصد یہ ہے کہ غیر خدا کے سامنے جھکنا تخلیق اور شرافتِ انسانی کے منافی ہے جس سے انسانی خود داری کی تذلیل اور شکست لازم آتی ہے -



خدائی نشانات!

دلائل کے بیان کرنے سے پہلے خداوندِ عالم جلّ مجدہٗ کی صفات جن کا ذکر کسی گذشتہ باب میں ہو چکا ہے۔ پر ایک دفعہ پھر نظر دوڑائیے تاکہ ان کی حقیقت واضح تر ہو کر یہ امر معلوم ہو جائے کہ ان سے کوئی چیز رہ تو نہیں گئی جو ہمارے ایمان کے لیے قابلِ ذکر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن اور سعادت مند بندوں کی تعریف میں ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ سطح عالم کی ہر ایک شئے اپنے خالق کا پتہ دے رہی ہے۔ اپنے مستقر پر قائم ہے اور اسکی قدرت و صنعت کی مظہر ہے تو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار تو نے جہان کی کوئی چیز بیکار پیدا نہیں فرمائی اور اسی طرح وہ اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کر کے اپنے ایمان کو مضبوط رکھتے ہیں۔ غالباً اسی حقیقت کو حضرت مصلح الدین سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کہ درختوں کا ہر پتّا اللہ تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ کی معرفت کا ایک دفتر ہے مگر اُن لوگوں کے لیے جو نظر ہوشیار رکھتے ہیں، ان لوگوں کیلئے نہیں جو سطحی نظر رکھنے والے ہوں۔

اس سے معلوم ہؤا کہ صنعت و قدرتِ خداوندی، حقیقتِ اشیاء اور رموزِ دہر صرف اہلِ نظر کا ہی حصّہ ہیں۔ جن کے ایمان میں وجدانی اور یقینی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہی خداوندِ عالم جلّ مجدہٗ پر صحیح ایمان لاتے ہیں۔ ہر ایک آنکھ میں یہ قدرت کہاں کہ ان رازوں کو سمجھ سکے۔ عوام الناس کا ایمان تو ایک رسمی، زبانی اور تقلیدی ایمان ہوتا ہے جو ذوق و وجدان سے محض ناآشنا ہوتا ہے۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

جہاں کی صورت کا ذرّہ ذرّہ جمالِ معنیٰ کا آئینہ ہے
مگر انہیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

حقیقت یہ ہے کہ موجودات کی تمام اشیاء کے راز صرف ان اشخاص پر ہی عیاں ہوتے ہیں۔ جو نظر حقیقت رس رکھتے ہیں۔ وہ اللہ جل شانہٗ کی صنعت وقدرت پتا پتا میں تو کیا دنیا بھر کے ذرہ ذرہ میں موجود اور کارفرما پاتے ہیں۔ پتا اور ذرہ کو درکنار رکھ کر اپنے آپ پر نظر غائر ڈالنے سے یہ راز طشت از بام ہو جاتا ہے کہ ناپاک پانی کی ایک بوند سے انسان کا ہیولا قائم ہوتا ہے۔ پھر وہ آغوش مادر میں پرورش پاتا ہے۔ پھر بچہ سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ ایک خاص وقت تک زندگی پھر آخر موت کے جنگل میں چلا جاتا ہے۔ گویا خود یہ حضرت انسان اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب صنعتوں اور قدرتوں کا مظہر ہیں۔ جبھی تو فرمایا گیا ہے کہ ہم تمہارے نفسوں میں ہی ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں خدا کی قدرت کی کتنی نشانیاں ہیں جن سے لوگ ہو کر گزر جاتے ہیں اور ان کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ معلوم ہوا اسکی صنعت تو ہر چیز میں عیاں ہے۔ مگر ہم ہی اس سے بے بہرہ ہیں۔ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام نماز میں رو رہے تھے تو حضرت ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ حضورؐ کیوں غمزدہ ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے اس لیے رو رہا ہوں۔ تحقیق زمین وآسمان کی پیدائش اور رات دن کے تغیر وتبدل میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ افسوس ہے اس شخص کی زندگی پر جو اس آیت کو پڑھے اور غور وفکر نہ کرے۔ آیت الکرسی کا مطالعہ کرنے سے کیا کچھ واضح نہیں ہوتا۔ اسلام کا سب سے پہلا سبق توحید ہے جو اس آیت سے انتہائی درجہ پہ واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے حسب ذیل مطالب کی وضاحت ہوتی ہے۔

(ا) اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے کیونکہ وہ زندہ اور قیوم ہے۔ اس کے سوا کوئی زندہ وقیوم نہیں۔

(ب) خداوند عالم اونگھ اور نیند سے پاک ہے کیونکہ اونگھ اور نیند غفلت کا باعث ہے۔ جو اس کے لیے محال ہے۔

(ج) سب چیز کا آسمانوں میں ہو یا زمین میں حقیقی مالک وہی ہے۔ جس میں کسی کی شرکت نہیں۔

(د) اس کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔

(ہ) اس کا تخت وسیع ہے جو آسمانوں اور زمین کو حاوی ہے اور کوئی چیز تخت الوہیت سے

باہر نہیں۔

(و) اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین کی حفاظت نہیں تھکاتی اور نہ وہ اس سے تھک سکتا ہے۔ کیونکہ وہ نہایت بلند و بالا اور بڑے مرتبے والا ہے۔

پھر سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے۔ بیشک رب تمہارا اللہ ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔ پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ وہی تمام کاموں کی تدبیر فرماتا ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی سفارش کنندہ نہیں۔ یہی اللہ تعالیٰ رب تمہارا ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ کیا پس تم نہیں سمجھتے۔

سورۂ آل عمران میں اور طریق یہی اشارہ فرمایا گیا ہے۔ تاکہ عوام بھی نشاناتِ الٰہیہ کو سمجھ سکیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے اور جس کو چاہے رزق بے شمار عطا فرماتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں داخل کرنا ان کی کمی بیشی کی دلیل ہے۔ کبھی رات چھوٹی ہو جاتی ہے اور دن بڑھ جاتا ہے تو کبھی رات بڑھ جاتی ہے اور دن کم ہو جاتا ہے۔ کبھی رات کی ساعتیں دن میں داخل ہو جاتی ہیں اور کبھی دن کی گھڑیاں رات میں چلی جاتی ہیں۔ یا رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا دور چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح زندہ کو مردہ سے اور مردہ سے زندہ کو نکالنا مراد ہے۔ یعنی زندہ مرغی سے انڈا پیدا ہوتا ہے اور پھر مردہ انڈے سے مرغی معرضِ وجود میں آتی ہے۔ یہی مثال نطفہ سے آدمی اور آدمی سے نطفہ پیدا ہونے کی ہے۔ اور اسی کو ناقص سے کامل اور کامل سے ناقص کو پیدا کرنا فرمایا گیا ہے اور اسی مفہوم کی جانب اشارہ فرماتے ہوئے سورۂ نساء میں بندوں کو متوجہ کیا گیا ہے۔ کہ اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا فرمایا۔ اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کر کے ان دونوں سے بے شمار مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ گویا ہم ہی تمہارے خالق ہیں۔ تم ہماری ہی عبادت کرو اور اپنے خالق کو پہچانو۔

پھر سورۂ انعام میں آیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ دن اور رات میں آرام پکڑتا ہے۔ اور وہی

سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ یعنی وہ تمام مخلوقات جو دن اور رات میں آرام سے زندگی بسر کرتی ہے اور ہزارہا آفات و بلیات سے محفوظ رہتی ہے اسی کی ہے اور یہ سب کچھ اسی کی رحمتِ کاملہ کی طفیل ہے اس سے بھی انسان کو اپنے مولا تعالیٰ کی جانب صحیح آگاہی مقصود ہے۔ اور اسی سورت میں دوسری جگہ یوں توجہ دلائی گئی ہے کہ کوئی زمین پر چلنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی پرندہ پر مارنے والا یعنی اڑنے والا مگر تمہاری طرح ہر ایک ایک گروہ ہے۔ گویا تمام حیوانات جو زمین پر چلتے یا رینگتے ہیں یا کھلی فضا میں پرواز کرتے ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح گروہ ہیں۔ اور ہر ایک میں کچھ امتیازی خصوصیات ہیں جس طرح کہ تم میں ہیں مگر تم سب سے اعلیٰ اور ممتاز ہو۔ اسی سورۂ کریمہ میں ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے کہ وہی ہے جو تم کو رات میں قبضہ میں لے لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کر چکے ہو جانتا ہے۔ پھر تم کو اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وعدہ پورا ہو۔ پھر اسی کی جانب تم لوٹائے جاؤ گے۔ پھر تم کو جو کچھ تم کرتے ہو اسکی خبر دے گا۔ گویا نیند اور بیداری کا بیان فرما کر معاد کی طرف خیال کو متوجہ کیا گیا ہے کیونکہ موت نیند سے مشابہت رکھتی ہے۔

پھر سورت انعام ہی کے ایک رکوع میں پوری تفصیل سے انسانی آگاہی کے لیے یہ مکمل اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی ہے۔ جو دانہ اور گٹھلی پھوڑ ڈالتا ہے اور زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے پھر تم کدھر کو بہکے جاتے ہو وہی صبح کی روشنی نکالنے والا ہے اور اسی نے آرام کرنے کو رات بنائی ہے اور حساب کرنے کو سورج چاند۔ اور یہ اس زبردست تدبیر والے کا اندازہ قائم کیا ہوا ہے اور اسی نے تمہارے واسطے ستارے بنا دیے ہیں تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں راستہ معلوم کرو۔ ہم نے نشانات (پتے) جو جاننے والے ہیں ان کو کھول کر بیان کر دیے ہیں۔ اور وہی خدا ہے جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا فرمایا۔ پھر ایک تمہارا ٹھکانا اور ایک امانت رکھے جانے کی جگہ ہے۔ ہم نے سوچنے والوں کے لیے کھول کر بیان فرمایا ہے۔ ہم ہی نے آسمان سے پانی اتارا ہے اور ہم ہی نے اس سے ہر اُگنے والی چیز نکالی اور کھیتی جس سے ہم ایک پر ایک چڑھا ہوا دانہ اور کھجور کے گابھے سے پھل کے جھکے ہوئے گچھے نکالتے ہیں اور انگور، انار اور زیتون کے آپس میں ملتے جلتے باغ جنکی رنگینیاں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ پھر ہر ایک درخت کے پھل کو دیکھو۔ جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے پر بھی غور کرو اور ایمانداروں کے

لیے ان چیزوں میں نشانات ہیں۔

الغرض اس رکوع میں بے شمار اشیاء کا ذکر کرکے یہ ثابت کرایا گیا ہے کہ یہ نظام دیکھ کر عقل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس ذات نے چند روزہ زندگی کے لیے اس قدر بے اندازہ اور لاتعداد سامان مہیا فرمائے ہیں۔ وہی قابلِ پرستش ہے اور آخرت کو اسی کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔

ایک اور مقام پر زیادہ وضاحت سے ارشاد ہوتا ہے کہ پیدا کیے گئے باغات جو چھتوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور بعض اپنے تنوں پر قائم ہیں اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن کے مختلف پھل ہیں اور پیدا کیا زیتون کو اور انار کو ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا جدا بھی۔ تاکہ تم ان کے پھلوں کو کھاؤ۔ جب وہ پھل لائیں اور اس کا حق ادا کرو۔ جس دن ان کو کاٹو اور بیجا خرچ نہ کرو۔ اللہ تعالےٰ کو بے جا خرچ کرنے والے پسند نہیں آتے۔ اور مویشی بوجھ اٹھانے والے اور رینگنے والے (زمین سے لگے ہوئے) پیدا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے رزق سے کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری مت کرو۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ آٹھ نر و مادہ بھیڑوں میں سے دو اور بکری میں سے دو پیدا کیے۔ آپ اے اللہ کے رسول علیک السلام ان سے پوچھئے کہ دونوں نر اللہ نے حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ جس پہ دونوں مادہ کے بچہ دان مشتمل ہیں۔ کوئی پکی اور مستند بات بتاؤ۔ اگر تم سچے ہو۔

اس آیت میں حیوانات اور نباتات کے اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ یہ چیزیں سب کی سب تمہارے لیے حلال ہیں۔ ان کو خواہ مخواہ اپنی قیاسی تاویلوں سے حرام مت کرو۔

پھر سورۂ اعراف میں آیا ہے کہ ہم نے تم کو زمین میں جگہ دی اور اس میں تمہارے لیے روزیاں مقرر فرمادی ہیں۔ اور تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ گویا ہم پر قدرت کا کس قدر احسانِ عظیم ہے کہ اس نے ہم کو زمین پر سردار بنایا اور قسم قسم کی نعمتیں ہمارا رزق بنائیں۔

اسی سورہ میں ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے چھ دن میں زمین اور آسمان پیدا فرمائے۔ پھر عرش پہ قرار پکڑا۔ دن کو رات پہ اڑھاتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے لگا چلا آتا ہے اور سورج، چاند ستارے اسی نے پیدا فرمائے۔ خبردار رہو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور اسی کا حکم چلتا ہے وہ بڑی عزت والا ہے جو تمام جہان کا رب ہے

اس آیت میں چھ دن کی مدت سے اسطرف اشارہ ہے کہ یہ تخلیق بتدریج وقوع میں آئی ہے جیسا کہ سنت اللہ جاری ہے۔ مگر اس کا علم نہیں کہ یہ چھ دن ان چوبیس گھنٹوں کے ہوں گے۔ پھر فرمایا وہی ہے جو بارش کے آگے آگے خوشخبری لانیوالی ہوائیں چلاتا ہے۔ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو لے آتی ہیں تو ہم ان کو ایک مُردہ شہر کی جانب ہانکتے ہیں اور اس بادل سے ہم پانی برساتے ہیں اور ہر طرح کے پھل اگاتے ہیں۔ ہم اسی طرح مردوں کو نکالیں گے۔ تاکہ تم غور کرو اور جو شہر پاکیزہ ہے اس سے اس کے رب کے حکم سے پاک سبزہ نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس سے ناقص نکلتا ہے اور یوں بدل بدل کر ہم حق ماننے والوں کے لیے آیتیں بتلاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح زمین اپنی استعداد کے مطابق اچھا پھل نکالتی ہے اسی طرح قلوب انسانی بھی روحانی بارشوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ مگر کچھ وہ بھی ہیں جو خراب زمین کی مانند خراب باتیں پیدا کر لیتے ہیں۔

اسی سورہ کے چوبیسویں رکوع میں مذکور ہے کہ وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا فرمایا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس آرام پائے۔ پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا تو اس کے ایک ہلکا سا خفیف حمل رہا اور وہ چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب بوجھل ہو گئی تو دونوں نے اپنے رب اللہ کو پکارا کہ اگر ہم کو چنگا بھلا بخشے تو ہم تیرا شکر کریں۔ اس آیت میں پیدائش انسانی کے متعلق اشارہ فرمایا کہ سورت یونس میں ارشاد فرمایا۔ وہی تم کو جنگل اور دریا میں سیر کراتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کشتیوں میں بیٹھیں اور لے کر چلیں اور لوگوں کو اچھی ہوا لگنے تو وہ اس پر اترائیں تو کشتیوں پر تُند ہوا آئی۔ اور ہر طرف سے موج اٹھی اور انہوں نے جان لیا کہ محصور ہو گئے تو خلوص سے اللہ کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو بچا لیا، تو ہم تیرے شکر گزار رہیں گے۔

ایک اور نشانی پر سورۂ ھود میں اشارہ کیا کہ جو کچھ زمین پر چلتا ہے۔ اس کو روزی اللہ ہی دیتا ہے اور وہ جائے استقرار اور سپردگی کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کھلی کتاب میں موجود ہے اور اسی نے چھ دن میں زمین و آسمان بنائے اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ یعنی پہلے پانی پیدا کیا گیا اور اس سے پھر

دوسری چیزوں کا مادۂ حیات بنا۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء میں بتایا گیا ہے کہ ہم نے ہر چیز کو پانی کے ذریعے زندگی بخشی اور عرش سے مراد بطور کنایہ قدرت ہے۔ پھر سورۂ رعد میں بیان ہوا ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے بغیر ستونوں کے بلند آسمان بنائے پھر عرش پر قائم ہوا اور سورج اور چاند مسخر فرما دیے۔ جو ہر ایک وقت مقررہ پر گردش کرتا ہے۔ کاموں کی تدبیر فرماتا ہے۔ اور نشانیاں ظاہر فرماتا ہے۔ تاکہ تم اپنے رب کے ملنے کا یقین کر لو۔ اور وہی ہے جس نے زمین پھیلائی اور اس پر پہاڑوں کو قائم کیا۔ ندیاں بہائیں اور ہر میوے کے جوڑے رکھے۔ دن پر رات کو ڈھانکتا ہے جس میں دھیان کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ زمین میں مختلف کھیت ایک دوسرے سے متصل اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں ہیں اور گھنی کھجوریں ہیں اور علیحدہ علیحدہ بھی جو سب ایک ہی پانی سے سیراب کیے جاتے ہیں۔ مگر ہم ان کو ایک دوسرے سے کھانے میں بڑھا دیتے ہیں اور ان چیزوں میں غور کرنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

یعنی ایک ہی زمین مختلف کھیت اور ہر کھیت میں مختلف رنگ و لذت کے میوے جو سب کے سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ اختلاف کیسے ہوا۔ اور ان کے مزے کس طرح سے ایک دوسرے سے جداگانہ ہوئے۔ ان سے کسی قدرت والے حکیم و علیم کا پتہ چلتا ہے۔

آگے ان ہی آیات میں اور وضاحت ہوتی ہے کہ وہی ہے جو تم کو بجلی ڈرانے اور امید کو دکھاتا ہے اور بھاری بادل اٹھاتا ہے۔ یعنی جب بجلی چمکتی ہے تو یہ امید بندھتی ہے کہ اب بارش ہو گی۔ اور ہماری کھیتیاں سیراب ہوں گی اور ساتھ ہی یہ خوف بھی دامنگیر ہوتا ہے کہ کہیں یہ بجلی گر کر ہمارے مالی و جانی نقصان کا باعث نہ ہو۔

دوسرے مقام پر مزید وضاحت فرمائی کہ اتارا ہم نے آسمان سے پانی اور اپنی اپنی موافقت سے ندیاں اور نالے بہنے لگے۔ پھر وہ جھاگ پھولا ہوا لے آئے۔ اور جس چیز کو آگ میں زیور کے لیے دھونکتے ہیں۔ یا اسباب کے لیے۔ اس میں ایسا ہی جھاگ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حق اور باطل کو بیان فرماتا ہے۔ سو وہ جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور وہ زمین پر باقی رہتا ہے۔ جو لوگوں کے

کام آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ یونہی مثالیں بیان فرماتا ہے۔

یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح آسمان سے پانی اترتا ہے اور اس سے ندی نالے بہتے ہیں اور ان میں کوڑا کرکٹ بھی شامل ہو جاتا ہے مگر پھر وہ علیحدہ ہو جاتا ہے اور اصلی چیز باقی رہ جاتی ہے اسی طرح معدنیات کو جب پگھلاتے ہیں تو جھاگ اور کھوٹ اوپر آجاتا ہے۔ اور پھر جل کر یا سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور اصل نفع بخش چیز باقی رہ جاتی ہے۔ اسی طرح کبھی حق پر باطل تھوڑی دیر کے لیے بالا ہو جاتا ہے۔ مگر آخر کار بقاء صداقت ہی کے لیے ہوتی ہے۔ ایک مقام پر سورۂ ابراہیم میں بیان ہوا ہے کہ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین جیسے کہ چاہیئے بنائے۔ اور اگر وہ چاہے تو تم کو ہلاک کر دے اور دوسری نئی مخلوق پیدا فرما دے۔ گویا زمین آسمان کا پیدا فرمانا اور کسی دوسری مخلوق کا لے آنا یا پہلی کا تباہ کر دینا اللہ تعالیٰ پر کوئی دشوار نہیں۔ اللہ تعالےٰ وہ ہے جس نے آسمان و زمین پیدا فرمائے اور آسمان سے پانی اتارا اور اس سے زمین سے رزق اور میوے نکالے اور کشتی کو تمہارے لیے فرمان کیا۔ کہ سمندر میں ہمارے حکم سے چلے اور ندیوں کو تمہارے کام میں لگا دیا۔ اور سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کر دیا جو ایک دستور پر متحرک ہیں اور دن رات بھی تمہارے کام میں لگا دیے اور جو کچھ تم نے مانگا ہم نے دیا۔ تم اگر اللہ تعالیٰ کے احسان شمار کرو تو نہ گن سکو گے بے شک آدمی بڑا بے انصاف و ناشکر گزار ہے۔ یعنی انسان اگر اپنے جسم میں غور سے دیکھے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ سینکڑوں چیزیں اس کی تابع فرمان ہو کر اس کی خدمت کر رہی ہیں۔ آسمان کی جانب نگاہ اٹھائے گا تو معلوم کرے گا کہ ہزاروں ستارے اس کی خدمت میں مشغول ہیں اور اسی طرح دریا، نہریں، سمندر سب کچھ اس کی تابع فرمان ہے۔ جس کا یہ شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اور سورۂ حجر کی بعض آیات سے اس موضوع پر اور کھلی روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہوا ہے کہ ہم نے برج بنائے اور دیکھنے والوں کی نظر کو ان سے رونق بخشی۔ اور شیطان مردود سے ہم نے ان کو محفوظ رکھا۔ مگر وہ بدبخت جو چوری سن کر بھاگا اور اس کے پیچھے چمکتا ہوا انگارہ پڑا۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور پھر اس پر بوجھ رکھے اور اس سے ہر چیز اندازہ سے اگائی۔

اور اس میں تمہارے لیے معیشت کے سامان بنائے اور وہ چیزیں جن کو تم روزی نہیں دیتے۔ اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو معین اندازے پر اتارتے ہیں۔ اور ہم نے رس بھری ہوائیں چلائیں۔ پھر آسمان سے پانی اتارا پھر وہ تم کو پلایا اور تمہارے پاس اس کا کوئی خزانہ نہیں۔ اور ہم ہی مارنے والے اور زندہ کرنیوالے ہیں۔ اور سب کے وارث ہم ہی ہیں۔ اور ہم تم میں سے آگے بڑھنے والوں اور پیچھے رہنے والوں کو جانتے ہیں اور تیرا رب ان کو اکٹھا کرنے والا ہے۔ اور بے شک وہی حکمتوں والا خبردار ہے..... ان آیات میں آسمان و زمین، بادل و بارش، چشمے، نہریں، ہوائیں، اسباب معاش اور بروج، نجوم و پہاڑ، خلقت انسان اور شہاب غرض بہت سی نشانیوں کا بیان فرمایا گیا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ آسمان و زمین ٹھیک ٹھیک بنائے جیسے چاہئیں تھے اور وہ بنانے والا خالق ان کے شریکوں سے بالاتر ہے۔ آدمی کو ایک بوند پانی سے بنایا اور وہ جھگڑا کرنے والا بولنے والا بنا۔ اور چوپائے پیدا فرمائے جن میں تمہارے واسطے دوسرے فوائد بھی ہیں کہ بعض کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ اور تمہارے لیے ان میں جب ان کو چراگاہ سے چرا کر لاتے ہو خوبصورتی ہے اور وہ تمہارے بوجھ ایسے شہروں کو لے جاتے ہیں جہاں تم بڑی مشکل سے پہنچتے ہو۔ بیشک تمہارا معبود نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ اور اس نے تمہارے واسطے گھوڑے گدھے اور خچر پیدا کئے۔ تاکہ تم ان پر سواری کرو۔ اور ان میں تمہارے لیے زینت ہے۔ اور وہ خالق پیدا فرماتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ تک سیدھی راہ پہنچتی ہے اور بعض راہ گم بھی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم سب کو سیدھی راہ دکھا دے اس میں البتہ غور کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔



دیدارِ الٰہی

جب ایک انسان خداوندِ عالم جلّ جلالہٗ کی الوہیت کا اقرار کرلیتا ہے تو اس کا یہ اقرار ان تمام تصوراتِ باطلہ کیلئیے موت کا پیغام ہوتا ہے ۔جن سے وہ آج تک اپنی تمنائے حسن وکمال کو بہلاتا رہا ہے۔ لیکن تصوراتِ باطلہ جو اپنی پیدا کی ہوئی عادت کے اندر جڑ پکڑ چکے ہوتے ہیں۔آسانی سے اس کے دل کو خالی نہیں کرتے اور اسکی محبت کی استعداد کا کلیتہً اور فوراً رہا نہیں ہونے دیتے تاکہ مومن بڑی جلدی اس کو کامل تصور کے لیے کام میں لا سکے۔ پھر رفتہ رفتہ ذکر وفکر اور سعیٔ عمل سے جوں جوں اسکی حقیقی محبت ترقی کرتی ہے اس کے اندر نئی اور صحیح عادات پیدا ہوتی ہیں ۔جنکی وجہ سے پرانی غلط عادات کا عمل رُک جاتا ہے ۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ نیک اعمال کو متواتر اور باقاعدگی سے جاری رکھا جائے ۔تاکہ انسان کو ان کی عادت ہوجائے ۔اور بُرے اعمال کو اور ان کے ساتھ بُرے تصورات کو بڑھنے پھُولنے کا موقع نہ مل سکے ۔ اسی لیے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اچھے اعمال وہ ہیں جن کو باقاعدگی سے جاری رکھا جائے اور نماز کو فرضِ مؤقت اسی لیے قرار دیا گیا ہے۔

پھر جب مومن اس طرزِ عمل سے اپنی قوتِ ایمانی اور کمالِ محبت سے ایک انتہائی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اپنے جذبۂ محبت کو اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر اپنی ہی ذات تک محدود نہیں رکھتا ۔بلکہ عام خلقت کی اصلاح کے لیے کام میں لاتا ہے کیونکہ شدتِ محبت ایک بے پناہ قوتِ عمل ہے جو رُک نہیں سکتی اور لازماً اپنے اظہار و استعمال کے لیے میدان میں تلاش کرتی ہے اور اس کا میدانِ عمل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ خدائے کائنات سے برگشتہ اور بھٹکی ہوئی مخلوق کو خدا کے حضور میں لانے کی کوشش کرے ۔چنانچہ اس غرض کے لیے وہ اپنی صفات جمال وجلال کو جو کسی کے خدا ہی کی صفاتِ جمال وجلال کا پَرتو لیے ہوئے ہوتی ہیں

حرکت میں لاتا ہے۔ چونکہ وہ خدا کی صفات سے متصف اور اس کے اخلاق سے متخلق ہوتا ہے اس لیے وہ ان صفات واخلاق کو اسی طرح کام میں لاتا ہے جسطرح خود خداوندِ عالم کا عمل ہے۔ اسی سے وہ خداوندِ عالم کا نائب اور خلیفہ قرار پاتا ہے۔ اور اسی سے خداوندِ عالم کی تخلیق وتربیت کا آلۂ کار بنتا ہے۔ اور مولا کریم کی تخلیق وتربیت اسکی تخلیق وتربیت کا جامہ اوڑھتی ہے۔ اور انسانیت کی خدمت وتربیت کے کام سے اسکی محبت پختہ و راسخ ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسکی تمنا رب العزت جلشانہٗ کے دیدار کی دعوت دیتی ہے اور خود بھی چاہتی ہے کہ دعوت دی گئی ذات کو دیکھے اور اپنی آخری تمنا کو پورا کرے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دیدارِ باری تعالیٰ ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے رویت کی حقیقت پر غور کرنا ہوگا۔

جب انسان کسی مادی چیز کو دیکھتا ہے تو اس چیز پر نظر ڈالنے اور رویت کا احساس کرنے تک جو عمل معرضِ وجود میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ:-

اس چیز سے جو روشنی کی شعاعیں بکھر رہی ہوتی ہیں وہ انسان کی آنکھوں پر پڑتی ہیں اور آنکھوں کا محدّب شیشہ انہیں سمیٹ کر چیز کا ایک عکس بناتا ہے۔ جس کی اطلاع عصبِ رویت کے ذریعے سے دماغ تک پہنچتی ہے اور دماغ کی معرفت انسانی شعور کو اس چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا جو چیز کسی جسم کو خارج میں موجود دیکھتی ہے وہ دراصل انسانی شعور ہی ہے اور شعور بھی جو چیز دیکھتا ہے وہ خود جسم نہیں ہوتا بلکہ اس جسم کے چند اوصاف ہوتے ہیں۔ جن کے مجموعہ کو نمونہ جسم قرار دیا جاتا ہے۔ دماغ عصبِ رویت، چشم، روشنی فقط ان اوصاف کا علم حاصل کرنے کے آلات ہیں۔ جن کو شعور اپنے کام میں لاتا ہے۔ پھر جب شعور کو ان اوصاف کا واضح علم حاصل ہو جاتا ہے تو خواہ وہ جسم آنکھوں کے سامنے رہے یا نہ رہے، شعور اگر چاہے تو اسکو پھر دیکھ سکتا ہے۔ پھر جس قدر شعور کا علم واضح ہوگا اسی قدر اس کی بلاواسطہ رویتِ جسم بھی واضح ہوگی۔ ایسے ہی جب مومن کے دل میں مظاہرۂ جمال سے حق تعالیٰ کے اوصاف کی محبت درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو ذکر وفکر کے دوران میں مومن کی ساری توجہ ان اوصاف پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ اوصاف اس کے شعور پر چھا جاتے ہیں اور ان کا علم اس کے شعور پر پوری طرح سے

حاوی ہوجاتا ہے۔ اس وقت مومن کا شعور حق تعالیٰ کو بالکل اس طرح دیکھتا ہے جیسے دنیا کی کسی اور چیز کو دیکھنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی رؤیت ان آنکھوں سے نہیں جو مادی اجسام کے دیکھنے کے لیے ایک ذریعہ بنائی گئی ہیں۔ اس لیے حدیث شریف کے الفاظ میں ہے کہ ایسے نماز پڑھ گویا کہ تو خدا کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی وہ دیکھتا تو ہے لیکن ان آنکھوں کے ذریعہ سے نہیں۔ جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ہم خدا کو روبرو اور ظاہر نہیں دیکھیں گے ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ ایمان لانا ہی خدا کو دیکھنے کی پہلی شرط تھی۔ پہلے دیکھ لینا ایمان لانے کو مشروط نہ تھا۔ اور اسی کٹ حجتی کے لیے ان کو سزا بھگتنا پڑی۔ کیونکہ وہ اپنے کمزور جذبات کی کشاکش اور زندگی کی پیکار کو دیکھ کر ہر قسم کی بھلائی سے مایوس ہو چکے تھے اور زندگی سے گریز کر کے سیدھے خدا کی جانب بڑھے مگر بارشاد قرآن وہ رجوع الی اللہ کا حق ادا نہ کر سکے۔

خداوند کائنات کے حسن وجمال کی کوئی انتہا نہیں کہ انسان اس انتہا کو پا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگان دین کے ارشاد کے مطابق مومن کی محبت اور معرفتِ الٰہی کی ترقی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے چنانچہ جنت میں اہل جنت کی پکار کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا پکاریں گے لیکن جنت میں مومن کی ترقی کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ حائل نہیں ہوگی جس کے دفعیہ کے لیے وہ مقابلہ یا جدوجہد کرنے کی ضرورت محسوس کرے اور پھر اس مقابلہ کے میدان میں کبھی کامیاب رہے اور کبھی ناکام ہو جائے بلکہ معرفتِ الٰہی کے جس معیار کو وہ دنیا میں حاصل کر لیتا ہے اس کی وجہ سے اس کے اندر یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ اسکی محبت خود بخود ترقی کرتی رہے اور وہ ہر آن حق تعالیٰ کے حسن وجمال کی ایک نئی جھلک دیکھتا ہے۔ اسوقت نہ تو اسکو اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ محبوب کی محبت اس سے باز رہیگی اور نہ کبھی اس بات کا غم لاحق ہوتا ہے کہ اس کی کسی لغزش یا خطا کے باعث وہ درحقیقت باز رہ جائیگی۔ انسان کی جو منزل اسکی فطرت کی رو سے قرار پائی ہے جب تک وہ وہاں تک پہنچ نہ جائے وہ فطرتاً مجبور ہے۔ کہ ہر آن آگے بڑھتا ہے۔ چونکہ اس کی منزلِ مقصود خدائے واحد ہے اس لیے محبت کا ارتقا موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس سے اس امر کا بھی انکشاف ہوگیا کہ چونکہ جس ذات کی تلاش ہے اس کی کوئی حد نہیں

اس لیے اس کی تلاش کی بھی حد نہیں۔

کتبِ شرعیہ سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن مومنین کو خدا کا دیدار ہوگا جس پر عقلی اور نقلی دلائل شاہد ہیں۔ عقلاً اس طرح کہ جو چیز موجود ہو وہ خارج عن الذات ہے۔ یعنی اگر خداوندِ عالم موجود ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یقیناً موجود ہے تو لامحالہ ماننا پڑے گا۔ کہ خداوندِ عالم جائز الرؤیت ہے اور اس جہان میں اس کا نظر نہ آنا اس کے ممتنع الرویت ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسان کی ان ظاہری آنکھوں کے سامنے ہزارہا حجاب حائل ہیں اور ان آنکھوں میں اس قدر طاقت نہیں کہ اس دنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے دیدار کر سکے۔ ہاں قیامت کے دن یہ تمام موانعات وحجابات دور ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ایک ایسا حاسہ پیدا فرمائیگا جس سے اسکا دیدار ہو سکے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ کہ مولا کریم کے دیکھنے کی آنکھیں اور اس کے دریافت کرنے کے حواس اس جہان میں عبادات وریاضات سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو ایسے حواس یہاں سے ساتھ نہ لے جائیگا وہ وہاں اندھا اٹھے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس جانب یوں اشارہ فرمایا ہے کہ جو شخص اس جہان میں اندھا ہوگا وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔

موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں آیت قرآنی رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ دیدارِ باری تعالیٰ جائز ہے اور جو لوگ اس مسئلہ میں دیدارِ الٰہی محال بتاتے ہیں وہ گمراہ ہیں۔ کیونکہ وہ مخالفین انبیاء علیہم السلام اور مخالفین سنت انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جس کو انبیاء علیہم السلام جائز فرمائیں ان کے مقابلہ میں مخالفین کی بے جا تاویلیں کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہی کے اس سوال پر غور کیا جائے تو اسی آیت سے مندرجہ ذیل نہایت واضح ثبوت مل سکے گا۔

(۱) یہ سوال موسیٰ علیہ السلام خود دیدارِ باری تعالیٰ کے جائز ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اگر دیدارِ الٰہی محال ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام طلب نہ فرماتے کیونکہ وہ اولوالعزم نبی تھے اور کسی نبی سے محال بات کا مطالبہ ہونا بھی محال ہے اور بالخصوص ایسی شئے میں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جہالت کی مقتضی ہو۔ یعنی اگر دیدارِ الٰہی محال ہوتا تو لازم آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو بدیہی معرفتِ الٰہی سے جہالت تھی (نعوذ باللہ) ایسی بات طلب کی جو اس کی شان میں محال تھی پس ثابت ہوا کہ دیدارِ باری تعالیٰ ممکن ہے اور اگر معترض یہ کہے کہ اگر ممکن تھا تو

حاصل کیوں نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیوی زندگی کی نظر میں یہ استعداد نہیں ہے کہ دیکھ سکے اور جواب لَنۡ تَرَانِیۡ اس پر شاہد ہے۔ جس میں موسیٰ علیہ السّلام کے نہ دیکھ سکنے کی نفی ہے نہ کہ مولا کریم کے دکھلانے کی۔ تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ اس انکار میں استعداد کی کمی ہی حائل تھی۔ نفی دیکھنے کی ہے دکھانے کی نہیں۔ کیونکہ قرآن وحدیث اور اجماع صحابہؓ و تابعین سے یہ امر ثابت ہے کہ اہلِ ایمان جنت میں دیدارِ خداوندی سے مشرف ہوں گے۔ جس طرح خداوند ذوالجلال بندوں کو دیکھتا ہے اور خود مکان وجہت سے پاک و منزّہ بھی ہے۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ بندے خداوند عالم جلّ وعلا شانہٗ کو ایسے دیکھیں کہ بندے تو خاص کسی مکان اور سمت میں ہوں اور وہ قدوس سمت اور مکان سے پاک و برتر ہو۔ کیونکہ رویت (دیکھنے) کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جس شئے کو دیکھا جائے وہ جسم ہی ہو۔ اور کسی خاص سمت اور مکان سے متعلق ہو۔ یہ تمام باتیں رویت کی شروط عادیہ ہیں عقلاً جائز ہیں کہ رویت کی تمام شروط موجود ہوں لیکن اگر حق تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ نہ چاہیں تو رویت نہ ہو۔ بلّی اندھیری رات میں چوہے کو دیکھتی ہے مگر ہم نہیں دیکھتے۔ آسیب والا جنوں کو دیکھتا ہے اور اُن سے باتیں بھی کرتا ہے مگر پاس والے نہ دیکھتے ہیں نہ کلام کرتے ہیں۔ سرکارِ دوعالم صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت جبریل امینؑ کو دیکھتے اور ان سے کلام فرماتے مگر حاضرینِ مجلس جبریل علیہ السّلام کی دید سے محروم رہتے۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی جائز ہے کہ بغیر ان شروط مزعومہ کے رویت ہو سکے۔ صورتِ اول میں رویت کی شروط موجود تھیں مگر رویت منتفی تھی۔ اور صورتِ ثانیہ اس کا عکس ہے کہ شروط مزعومہ منتفی ہوں۔ اور رویت متحقق ہو۔ حضرت ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوبکر بن فواک کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ ایک مرتبہ استاذ ابوسہل سے یہ سوال کیا گیا۔ کہ کیا عقلاً اللہ تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ کی رویت ممکن ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ لقاءِ خداوندی اور دیدارِ باری تعالیٰ عزاسمہٗ کی طرف اہلِ ایمان کا اشتیاق ہی اس کے امکان کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ شوق ارادۂ مُفرطہ کا نام ہے اور ارادہ محال سے متعلق نہیں ہوتا۔ پھر سائل نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے جو اس کی لقاء کا مشتاق ہے۔ فرمایا کہ ہر شخص مسلمان مخلص لقاءِ خداوندی کا مشتاق ہے۔ البتہ تجھ جیسا بے حس مشتاق نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اشتیاق خلافِ عقل نہیں۔ بلکہ عدمِ اشتیاق خلافِ عقل ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے مربّی ومحسن کے لقاء و دیدار کا مشتاق نہ ہو۔ ہر عقلمند

کو جب کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو اس کی نگاہیں اسی مربی کی جانب دوڑتی ہیں اور دل اسی کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔ یہ اشتیاق نہیں تو اور کیا ہے۔ الغرض دیدارِ الٰہی عقلاً ممکن ہے اور مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے وقوع کی خبر دی ہے۔ جس پر ایمان لانا واجب اور ضروری ہے۔

(ب) سوال ایک جائز امر کا تھا۔ جس کے جواب میں تردید نہیں فرمائی گئی۔ بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیدارِ الٰہی دنیا میں جائز ہے اور قیامت میں واقع ہوگا۔ کیونکہ لَنْ تَرَانِیْ کے جواب سے یہ بھی تو ثابت نہیں ہوتا کہ تو کبھی نہ دیکھے گا۔ یا تیرے سوا کوئی دوسرا بھی نہیں دیکھے گا۔ اور نہ ہی یہ انکار محال پر اور نہ محال کی ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔

(ج) اگر دیدارِ باری تعالیٰ محال ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرما دیتے کہ میں نہیں دکھتا۔ کیونکہ میں مرئی نہیں ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ نے نہ موسیٰ علیہ السلام کو مایوس فرمایا اور نہ اس سوال پر عتاب کیا۔ معالم میں ہے کہ لَنْ تَرَانِیْ کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں چشمِ فانی سے کوئی بھی مجھ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اور آخرت میں چشمِ باقی سے دیدار نصیب ہوگا۔

(د) خود اللہ تعالیٰ نے دیدار کو پہاڑ کے مستقر رہنے پر معلق کیا ہے اور پہاڑ کا مستقر رہنا ممکن ہے۔ لہٰذا دیدار بھی ممکن ہے کیونکہ جو چیز کسی ممکن چیز پر مشروط ہو وہ اس کے ممکن ہونے پر دلالت کرتی ہے اور پہاڑ کا استقرار ممکن ہونا اس دلیل سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا۔ پس دیدار جو اس ممکن پر معلق ہے وہ بھی ممکن ہوا۔ علاوہ ازیں بوقت تجلی پہاڑ کا ٹھیرا رہنا ممکن ہے جبکہ اللہ تعالیٰ پہاڑ میں ایسی قوت پیدا فرمادے کہ وہ ٹھیرا رہے۔ پس ممکن پر جو معلق ہو وہ بھی ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا دیدارِ الٰہی محال نہ ہوا۔ یعنی دیدار کو پہاڑ کے استقرار پر مشروط کیا کہ اگر پہاڑ مستقر رہے تو تجھ کو بھی دیدار حاصل ہوگا۔ پس پہاڑ مستقر رہتا تو موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیدار واقع ہوجاتا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تم قیامت میں اپنے پروردگار جل شانہ کو اس چاند کے دیکھنے کی طرح دیکھو گے۔ جس کے دیکھنے میں کوئی حجاب اور مزاحمت نہ ہوگی۔ نیز حدیث شریف میں بروایت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ آیا ہے کہ آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

جنتی لوگ اپنے اپنے خیال میں ہوں گے کہ یکایک ایک نور چمکے گا۔ پس وہ اپنا سر اٹھائیں گے تو ناگہاں اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ فرمائیگا اور فرمائیگا اے اہلِ بہشت السلام علیکم۔ پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا یہی ارشاد ہے کہ خدائے رحمٰن سے تم کو سلام ہے۔ جنتی سنیں گے اور اللہ تعالیٰ انکی طرف دیکھے گا۔ اور وہ اپنے رب کی طرف دیکھیں گے اور دیدارِ الٰہی کی لذت میں ایسے محو ہوں گے کہ وہ جنت کی کسی چیز کی جانب التفات نہ کریں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اہلِ ایمان رب العزت کو قیامت کے دن بغیر احاطہ وادراک اور بغیر مثال وکیف کے دیکھیں گے اور رب العزت کے جائز الرویت ہونے میں کوئی استحالہ نہیں اور اس حقیقت کے انکشاف پر قرآن کریم کی دوسری بہت سی آیات وارد ہیں جن کے اندراج کی اس مختصر میں گنجائش نہیں۔ ہاں ان لوگوں کے لیے جو مغلوک الایمان اور مایوس اللقاء ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عیاناً دیکھنا محال ہے اور آیت کے مفہوم سے بھی یہ بات ثابت نہیں کیونکہ نظر جو آیت میں آئی ہے اور چیز ہے اور رویت دیکھنا اور چیز ہے۔ نظر دیکھنے کا آلہ ہے جیسے کان سننے کا۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ایک چیز پر نظر ڈالے اور وہ دکھائی نہ دے۔ اور کوئی بات سننا چاہے اور وہ سنائی نہ دے۔ خصوصاً نظر کے بعد الیٰ کا لفظ کلام عرب میں انتظار اور توقع کے معنے دیتا ہے اور لا تدرکہ الابصار کا بھی یہی مفہوم ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں کہ نظر رویت کے معنوں میں بہت مستعمل ہے۔ عربی زبان کے اشعار اور بہت سی قرآنی آیات اس پر دال ہیں اور الیٰ کے ساتھ بھی دیکھنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور آیت لا تدرکہ الابصار میں ان ظاہری اور جسمانی آنکھوں کے دیکھنے کی نفی ہے جو عالمِ ناسوت میں مکدرات کے دیکھنے کے لیے مخصوص ہیں۔ نہ عالم آخرت میں۔ جہاں اور آنکھیں عطا ہوں گی اور یہ بھی یاد رہے کہ اس آیت میں نفی ادراک کی ہے جو ہر طرف سے گھیر لینے کے لیے بولا جاتا ہے محض دیکھنے کی نفی نہیں اور اسی حقیقت پر تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین و تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین متفق ہیں۔

———✕———

کرسی کی حقیقت

ذات وصفاتِ خداوندی کے متعلق ہمیں وہ ہی عقیدہ رکھنا چاہیئے جو قرآنِ کریم نے اور سرکارِ دوعالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ تفسیر بالرائے یا قیاسی تشریح جو ان دونوں امور سے باہر ہو کرنے سے پرہیز واجب ہے۔ کیونکہ اپنے عقل وقیاس اور استنباط سے اُن عقائد میں دخیل ہونا جن کی تفصیل سربستہ اسرار اور عقدہائے لاینحل سے خود قرآنِ کریم اور احادیثِ نبی رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہیں ان کا جاننا صحتِ اسلام کے لیے ضروری نہیں۔ نہ ان کو ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق ہے۔ بلکہ ان کا تعقل انسانی فہم ادراک سے باہر ہے۔

اسلام کے بعض گمراہ فرقے اس لیے صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے کہ وہ اس اصول پر قائم نہیں رہے اور ان کی عقول نے مذہب سے جب کچھ جواب مانگا تو بلا سوچے سمجھے نصوصِ شرعیہ کی تاویلیں کرنے لگے حالانکہ ان کو عقل وادراک کی سرحد پر پہنچکر ٹھہر جانا چاہئے تھا پس ایسے مسائل میں جو صفاتِ باری سے متعلق ہوں۔ اہل سنّت والجماعت کا مسلک ہی صحیح ہے۔ چنانچہ سفیان ثوری، مالک بن انس۔ ابن عینیہ اور ابن المبارک وغیرہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ صفاتِ الٰہی پر ایمان لایا جائے۔ مگر ان کی کیفیت وحقیقت دریافت نہ کی جائے گی۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان کی تحقیق سے منع فرمادیا ہے۔ یعنی مخلوق میں تو غور وفکر کرو مگر خالق میں نہ کرو۔ اس کی وجہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کو مسائل صفاتِ الٰہیہ میں غور وخوض کرنے کی اجازت دی جاتی تو خود بھی گمراہ ہو جاتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے اور بہت سی صفات ایسی ہیں کہ اگرچہ ان سے خداوندِ عالم کا وصف کیا جانا فی الاصل صحیح تھا لیکن کفار نے ان الفاظ کو غیر محل پر محمول کیا اور گمراہانہ تخیل ان میں پھیل گیا۔ اس

لیے اسلامی شریعت نے اس مفسدہ اور گمراہی کا سدِ باب کرنا ضروری سمجھا اور بہت سی صفات ایسی بھی ہیں جن سے خلافِ مراد ظواہر کے لیے استعمال کرنا سمجھا جاتا ہے۔ پس لازم ہوا کہ ان سے احتراز کیا جائے اور انہی وجوہات کی بنا پر شریعت نے صفات باری کو توفیقی ٹھیرایا ہے۔ اور اپنی رائے سے ان میں غور و فکر کرنا جائز نہیں رکھا۔

کرسی کے لغوی معنے ایک چیز کا دوسرے سے ملنا ہے۔ اور ظاہری کرسی کو بھی اسی لیے کرسی کہتے ہیں کہ اس کی لکڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ علماء محققین نے اس مسئلہ میں لکھا ہے کہ ذاتِ خداوندِ جل شانہٗ کرسی اور تخت پر بیٹھنے اور قیام فرمانے سے پاک ہے۔ یہ الفاظ بطور استعارات اس کی ذاتِ مقدس کے لیے کتاب اللہ میں مستعمل ہوئے ہیں۔ درحقیقت ان کے معنے سلطنت و قدرت کے ہیں جو ہر چیز کی ایجاد کے لیے اصل ہے تو دوسرے معنوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اس تقدیر پر آیت کے مفہوم میں یہ ثابت ہوگا کہ اس کی قدرت آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور کوئی چیز اس سے باہر نہیں اور یہ قرینِ قیاس بھی ہے کیونکہ خداوند عالم بندوں سے ان کی عادات اور عرفی محاورات کے مطابق کلام فرماتا ہے۔ اس سے ظاہری معنے مراد نہیں مگر اہلحدیث یہ کہتے ہیں کہ ان الفاظ کے جو بھی معنے ہیں اس کی ذات کے لیے ثابت ہیں۔ لیکن ہم اسکی حقیقت و کیفیت کو نہیں جانتے۔

وہ آیت جس میں کرسی کا ذکر ہے یوں ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ یعنی اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمینوں کا احاطہ کر لیا ہے اور اس کی تفسیر میں مفسرین کے چار اقوال ہیں۔

(۱) یہ کہ کرسی سے مراد ایسا کوئی جسمِ عظیم ہے جو آسمانوں اور زمینوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ پھر اس قول میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کرسی بھی عرش کے معنوں میں ہے، اور دونوں سے مملکت اور ملک کے لیے کنایہ لیا جاتا ہے۔ گویا عرش و کرسی دونوں ایک ہی چیز ہیں اور بعض حضرات کا قول ہے کہ کرسی عرش سے جُدا ایک جسمِ عظیم ہے جو ساتویں آسمان پر عرش کے اوپر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ساتویں آسمان کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے۔ اور بعض کا ارشاد ہے کہ کرسی سے مراد (روحِ اعظم) کے قدم رکھنے کی جگہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ملکِ عظیم ہے۔

(ب) یہ کہ کرسی سے مُراد سلطنت، قدرت اور ملکیت الہٰی ہے۔

(ج) یہ کہ کرسی سے مقصود خداوند عالم جلّ جلالہٗ کی عظمت و کبریائی کی تصویر ہے اور اسی کو ابی المسعود نے اختیار کیا ہے۔

(د) یہ کہ کرسی سے مراد اسم الہٰی ہے۔ یعنی اس کے علم نے آسمان و زمین کو گھیر رکھا ہے۔

ان چاروں اقوال مندرجہ بالا کو نقل کرنے کے بعد امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی تعریف ہے اور یہ قطعی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور منزّہ ہے کہ اس کا مقام کعبہ میں ہو جیسے یہ پاکیزگی مسلّمہ ہے ویسے ہی عرش و کرسی کے قرار سے تنزّہ ایک قطعی حقیقت ہے۔ کا کلام ہے۔ یہ جواب اگرچہ بقول سوئم کہ وہ خدا کی عظمتِ شان، وسعتِ سلطنت اور احاطتِ علم کی تمثیل ہے روشن ہے مگر معتمد علیہ قول اوّل ہی ہے کیونکہ الفاظ کو بغیر دلیل کے ظاہری معنوی سے پھیرنا جائز نہیں۔

علاّمہ تفتازانی کا قول ہے کہ یہ اسی بات سے ہے کہ ایک وہمی حسّی چیز سے ایک معنی اعقلی حقیقی پر دلالت کر دی گئی ہے۔ جو کہ عقلِ بشر سے باہر ہے اور بیضاوی کی تحقیق یہ ہے کہ نہ کرسی ہے اور نہ اس پر اللہ تعالیٰ کا بیٹھنا ممکن۔ بلکہ یہ فقط ایک تمثیل ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو بندوں کے ذہن میں بقدرِ امکان ڈالنا مقصود ہے۔ بعض حضرات نے اس کی حقیقت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ اس سے مراد وہ قدرتِ عظیمہ باری تعالیٰ ہے جس سے آسمانوں اور زمینوں کا قیام ہے۔ بعض متقدمین نے کرسی سے مراد کسی چیز کی بنیاد بھی کی ہے اور قاموس میں ہے کہ کرسی بمعنے علم ہے اور اسی لیے علماء کو کراسی بھی کہتے ہیں۔ اور یہ معنے لغت کی مناسبت سے زیادہ قابلِ قبول ہیں۔



مسئلۂ کشفِ ساق

قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ دن آنے والا ہے جب کہ ساق کھُلے گی اور اُن لوگوں کو جو دنیا میں سجدہ نہیں کرتے تھے سرافگندگی کی دعوت دی جائیگی مگر اس وقت ان میں اتنی قدرت و استطاعت کہاں؟ انکی آنکھیں جُھکی ہوں گی۔ صورتوں پر ذلت چھا رہی ہوگی اور وہ سجدہ نہ کرسکیں گے۔

کشفِ ساق (پنڈلی کھولنے) کی تشریحی کیفیت کیا ہے یہ ان روایتوں سے معلوم ہوتی ہے:-

(ا) قیامت کے دن خداوندِ عالم جلّ وعلا شانہٗ، ممثل ہونگے۔ اسوقت مسلمان سامنے سے گزریں گے تو سوال ہوگا تم کس کی عبادت کرتے ہو۔ وہ عرض کریں گے کہ خدائے واحد کی۔ پھر خطاب ہوگا کیا تم خدا کو پہچانتے ہو؟ وہ عرض کریں گے پہچنوائیگا تو کیوں نہ پہچانیں گے۔ یہ سن کر رب العزت اپنی ساق کھول دیں گے اور جتنے مسلمان ہوں گے دیکھتے ہی سجدے میں گر جائیں گے اور منافقین کا گروہ سر جھکانا چاہے گا تو نہ جھکا سکے گا۔ ان کی پیٹھ سخت ہوجائیگی۔ یہ امتیازی فرق مسلمانوں کو منافقوں سے متمائز کر دیگا۔

(ب) قیامت کے دن کفّار و مشرکین کے روبرو اُن کے بُت لائے جائیں گے کہ دیکھو تم انہی کو پُوجتے تھے اب ان ہی کے ساتھ جاؤ دوزخ میں چلو۔ پھر مسلمانوں کی نوبت آئیگی۔ خداوندِ عالم جلّ وعلا شانہٗ، اپنی ساق ان کے لیے کھول دیں گے۔ سب کے سر جُھک جائیں گے اور منافقین سجدہ نہ کرسکیں گے اور جہنم میں گھر بنائیں گے۔

(ج) اہلِ قیامت خداوندِ عالم جلّ مجدہٗ کے روبرو چالیس برس تک ٹکٹکی باندھے کھڑے رہیں گے۔ برہنہ سر۔ برہنہ پا۔ برہنہ جسم، غرقِ عرق، چالیس برس تک اسی عالم میں رہیں گے۔ مگر کوئی خطاب تک نہ ہوگا آخر میں خداوندِ عالم کی ساق کھل جائیگی اور پیشانیاں وقفِ سجود ہوجائیں گی۔

(د) قیامت میں منادی ہوگی کہ ہر گروہ اپنے اپنے سر گروہ کے ساتھ ہو جائے۔ بُت پرستوں کے ساتھ۔ باطل پرست اپنے بے حقیقت پیشواؤں اور دیوتاؤں کے ساتھ ہولیں گے اور سب آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔ پھر خاصانِ بارگاہ جب باقی رہ جائیں گے تو خداوندِ عالم اپنی صورت بدلیں گے۔ ساق کھُل جائے گی۔ اور منافقین کے علاوہ تمام اہلِ اسلام سربسجود ہو جائیں گے۔ آگے چل کر اپنی روایتوں میں پُل صراط کا تذکرہ بھی ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ جہنم کے شعلے شرر افشانی کر رہے ہوں گے۔ آگ کا سمندر لہریں مار رہا ہوگا۔ یہ پُل اسی کے وسط میں بچھایا جائیگا اور اسی کو عبور کرنے پر بہشت کی فضائل سکیگی۔ تاریکی قیامت کی محیط ہوگی اور اسی تاریکی کے عالم میں پُل پر سے گزرنا پڑے گا۔ جو ایماندار ہوں گے وہ تو انوارِ الٰہیہ کی روشنی میں اس مسافت کو طے کریں گے مگر اہلِ کفر کے لیے انوار کہاں؛ گزرتے ہوئے کٹ کٹ کر گریں گے اور دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

اسلام کے علمی زمانے میں ان روایتوں کے قبول و رد میں کافی بحث ہو چکی ہے لیکن جب روایتیں ہی مقطوع الاسانید ہوں بدیہی البطلان ہوں اور صدوق و ثقہ رواۃ نہ رکھتی ہوں تو اُن کو روایت سمجھنا اور ان سے استدلال کرنا کس طرح صحیح ہو سکے گا۔

کشفِ ساق کے الفاظ ادبیاتِ عرب میں کن معنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اس حقیقت کو سمجھنے کے لیئے پہلے دو خاص مقدمے ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں۔ کہ جب تم کو کسی قرآنی لفظ کے معنی معلوم نہ ہوا کریں تو شعراءِ عرب کے اشعار کو دیکھا کرو۔ اس لیے کہ ہر زمانے، ہر ملک ہر قوم اور ہر زبان کے خاص خاص محاورات ہوتے ہیں اور اسی طرح حضرت مجاہد کا قول ہے کہ ایسے الفاظ حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے۔ نمبرا، کہ روحانیت کے ساتھ کمالِ اتصال کو تورات کے محاورے میں خدا سے لڑنے اور کشتی کرنے کو تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن میں تزاحم و اشفاق کو آسمان کا رونا فرمایا گیا ہے۔ اردو میں انکار کے لیے کانوں پر ہاتھ رکھنا استعمال ہوتا ہے۔ حریفوں کو پامال کرنے کے لیے فارسی کے قدیم محاورے میں دشمن گزائی کا لفظ مستعمل ہوتا تھا۔ اعتلاء و اقدام کے لیے بازو برافروختن کہتے تھے۔ غرضیکہ ان سب محاورات کے اطلاق کو دیکھا جاتا تھا۔ الفاظ کے اصلی معنوں سے بحث نہ تھی۔ نمبر(۲)، اسلوبِ تعبیر

کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حقیقت دوسرے مجاز۔ محل حقیقت و مجاز میں مختلف مناسبتیں ہوا کرتی ہیں جن سے ایک ہی لفظ پہلے کسی اور معنے کے لیے مستعمل تھا۔ اب ایک جداگانہ معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے اور قرآن کریم ایک خاص مقام پر فرما رہا ہے۔ جہاں کہیں تین شخص گرم راز و نیاز ہوں وہاں ان کا چوتھا خدا ہے۔ پانچ ہوں تو ان کا چھٹا شریک خدا ہے اس سے کم یا زیادہ جس تعداد میں بھی ہوں خداوند عالم ان کے ساتھ ہے۔

یہ حقیقت اس مجاز سے وابستہ تھی کہ تین ہم صحبتوں کا چوتھا شریک اور پانچ شرکاء مجلس کا چھٹا جلیس ان کے مکالے سے آگاہ ہوتا ہے۔ ان کی رازداریاں اس پر منکشف ہو سکتی ہیں اور وہ ان کے خفیہ امور کو سن اور سمجھ سکتا ہے اور آیت کا بھی یہی مدعا تھا۔ نہ اس کے لیے اس سے بہتر اسلوب ممکن تھا۔

ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔ خوب جان رکھو کہ انسان اور اس کے دل کے درمیان خداوند قدوس حائل ہو جایا کرتا ہے۔ گویا جسم اور دل کے مابین حائل ہونے والے سے بڑھکر اور کون ہے جس کو مخفی نیتوں اور پوشیدہ پروگراموں کا حال معلوم ہو سکے۔ یہاں بھی جناب الٰہی کی یہی غرض تھی لہٰذا حقیقت اس مجاز کے لباس میں نمودار ہوئی۔ یعنی حائل سے مراد ....

ایک تیسری آیت میں ہے کہ خداوند قدوس کو اظہار حق کوئی شرم نہیں۔ گویا شرم و حیا کی حقیقت یہ ہے کہ طبیعت میں ایک ایسا انکسار و انفعال پیدا ہو کہ ارتکاب قبائح سے نفس کو روک دے۔ پھر ظاہر ہے کہ شان الوہیت اس حقیقت سے نہایت ارفع ہے۔ لیکن تجوّز کے لیے یہاں ایک مجازی مناسبت موجود تھی۔ یعنی شرمیلی طبیعتیں جس چیز سے حیا کرتی ہیں اس کو ترک کر دیا کرتی ہیں۔ اس طریق تعبیر کرنے کو قرآن نے بتایا کہ شرم کرنے والے تو شرم کی بات کو ترک کر دیتے ہیں مگر ربِ قدّوس کی بارگاہ اس سے پرے ہے ۔ وہاں حقیقت حیا کی سمائی نہیں کہ حیا کرنے والوں کی طرح وہ بھی اظہار حق کو چھوڑ بیٹھے۔

اور ایک مشہور آیت الرحمٰن علی العرش استوٰی یعنی خدائے قدوس تخت پر کھڑا ہوا کھڑے ہونے کی حقیقت میں استیلاء کا مجاز مضمر تھا۔ چنانچہ اب بھی محاورے میں کہتے ہیں۔ فلاں ملک کا تخت متزلزل ہو گیا۔ یعنی اس کے استیلاء میں ضعف آ گیا۔ قرآن کو بھی یہ حقیقت اسی مجاز کے اسلوب میں نمایاں کرنی تھی۔ ایسے ہی سورہ رحمٰن کی ہیبت ناک وعید ہے۔ اور حکم ہوتا ہے اے دو نو جماعتو۔ ہم عنقریب

تمہارے لیے خالی ہو کر فراغت کیا چاہتے ہیں۔ فارغ ہونے اور خالی ہو بیٹھنے کی حقیقت اس مجاز نے واضح کر دی کہ جن لوگوں کے مشاغل کثیر ہوتے ہیں وہ کوئی مہتم بالشان کام کرنا چاہیں تو اس مشغولیت کے عالم میں خاطر خواہ نہ کر سکیں گے۔ اس کے لیے انہیں ایک مخصوص وقت نکالنا ہوگا۔ مفہوم کو دل نشین بنانے کے لیے قرآن کریم نے بھی اس مجاز کو لے لیا کہ لوگو خبردار رہو۔ تمہارا احساب کرنے کے لیے ہم عنقریب ایک فارغ اور خالی وقت نکالنے کو ہیں۔ کہ اچھی طرح سے محاسبہ ہو اور کافی امتحان و اختبار ہو جائے۔

پس اہلِ حق کے نزدیک لفظ حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے۔ لہٰذا اس سے استعارہ مراد ہے اور اس میں چند اقوال ہیں۔

اوّل یہ کہ اس سے مراد شدت و کرب ہے جو قیامت کے روز ہوگا۔

دوم ابی سعید خدری فرماتے ہیں کہ کشف ساق سے مراد پردہ اور اصل کا کھل جانا ہے۔

سوم علامہ ابن جریر فرماتے ہیں کہ مفسرین صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ آیت "وہ دن جب ساق کھلیگی" کے یہ معنے ہیں کہ امر شدید ظاہر ہوگا۔

چہارم۔ حضرت عبداللہ بن عباس اس کی مثال میں کہا کرتے تھے کہ عہدِ جاہلیت کا ایک محاورہ تھا کہ جنگ نے اپنی ساق سے آزار کو اٹھا لیا یعنی پوری طرح جنگ چھڑ گئی۔

پنجم عکرمہ سے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے کہ وہ دن کرب و سختی کا دن ہوگا۔

ششم۔ عز بن عبدالسلام لکھتے ہیں کہ اس آیت کے معنے مجازی ہیں مراد یہ ہے کہ دشمنانِ خدا کے محاسبہ و تذلیل و تعذیب میں مبالغہ ہوگا۔ جب کوئی شخص کسی کام میں نہایت مبالغہ کے ساتھ کوشش کرتا ہے تو اہلِ عرب کہتے ہیں اس نے اپنی ساق کھول دی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب کوئی شخص کوئی بڑا کام سرانجام دینا چاہتا ہے تو آزار چڑھا لیتا ہے تاکہ پوری سرگرمی اور تیزی کے ساتھ اس کو کر سکے اور حرج واقع نہ ہو۔

اس تشریح نے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ حدیث میں دامن جھاڑتے ہوئے چلنے کی نسبت جو وعید وارد ہے کہ جو شخص غرور و تکبر سے تہ بند کے دامن کو گراتے ہوئے چلے گا قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کی جانب ملتفت نہ ہوں گے کا مفہوم اس ممانعت پر ہی حاوی نہیں ہے کہ تہ بند یا عبائیں یا پاجامے اس قدر نیچے نہ

پہننے چاہئیں کہ موہریاں یعنی (پائینچے) قدم تک کو چھپالیں اور زمین پر لوٹتی چلیں بلکہ اسکے ساتھ یہ مدعا بھی مضمر ہے کہ مسلمان کو مغرور نہ ہونا چاہیئے اور نہ فرطِ غرور سے اس کیلیئے غافل رہنا زیبا ہے۔ خداوندِ عالم کتنی ہی دولت دے کیسی ہی ثروت عطا فرمائے کتنی کچھ منزلت ہو مگر اسکو ہر حال میں آگاہ رہنا لازم ہے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں مشکلات پیش آنیوالی ہوں وہ ان کے حل کرنے کے لیے پہلے ہی سے آمادہ و مستعد رہے۔ عہدِ جاہلیت کے مشہور سخن سنج درید بن الصمہ کے کلام میں بھی یہی مفہوم مخفی ہے۔

مزید تشریح کے لئے مسئلے کو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ شیء خداوندِ عالم کے ساق نہیں ہے لیکن جنگ کے بھی تو ساق نہیں ہے جس کے متعلق عربی محاورات میں کہا جاتا ہے کہ جنگ نے ان لوگوں کے روبرو اپنی ساق کھول دی اور صاف و صریح خطرہ نمایاں ہوگیا۔

خطرے کے بھی دانت نہیں ہوتے مگر عرب کے شعرا اس کو یوں بیان کرتے رہے ہیں کہ بعض وہ لوگ ہیں جہاں خطرے نے انہیں دانت دکھائے وہ دو دو ایک ایک ہوکے اُڑ چلے۔

یوں ہی موت کے ناخن۔ نرمی و ذلت کے پر۔ قرآنِ کریم کے ہاتھ۔ کفر کے ہاتھ۔ ملکیت رکھنے والوں کے ہاتھ یا داہنے ہاتھ وغیرہ الفاظ بھی محاورات میں مستعمل ہیں اور قرآنِ کریم میں تو نہایت واضح ہیں۔ غرض یہ ہے کہ تعبیرِ کلام میں اعضائی جوارح کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس سے وہ معانی مراد لیتے ہیں جن کا اصل مفہوم سے الگ ہونا درست نہیں۔

اسی مناسبت سے قرطبی نے کہا کہ کشفِ ساق کے متعلق یہ اعتقاد یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے عضو و جسم نہیں ہیں اور نہ وہاں کھولنا اور بند کرنا ہوسکتا ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ جلّ و علا شانہٗ اپنی قدرتِ کاملہ سے امرِ سخت ظاہر فرمائیں گے۔

حضرت ابو موسےٰ رضی اللہ عنہٗ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام سے عرض کیا گیا کہ ساق کے کیا معنے ہیں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نورِ عظیم ظاہر فرمائے گا جس سے سب سجدے میں گر جائیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز یہی کشفِ ساق کی گھڑی سب سے سخت اور شدید ترین و ہولناک گھڑی ہوگی۔ عوفی نے

روایت کیا کہ آخرت میں داخل ہونا اور سخت معاملہ کھلنا اور اعمال کا ظاہر ہونا ہی کشف ساق ہے۔ زمخشری نے کہا کہ ساق کھولنا سختیٔ کار کے واسطے مثل ہوگیا ہے اور ابنِ کثیر کے نزدیک رحمۃ اللہ علیہ مختار یہی ہے کہ کشف ساق ایک شدید تجلیٔ الٰہی ہے اور جمہور سلف نے اسی قول کو معتمد علیہ فرما کر کہا ہے کہ کشف ساق شدت وصعوبتِ امر سے عبارت ہے جو یومِ قیامت حساب وجزا کے لیے پیش آئے گی وہ اس کے معنوں میں کلام نہیں کرتے۔ لیکن یہ فرماتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس سے جو مراد ہے وہ اللہ تعالےٰ ہی کی طرف تفویض کرتے ہیں۔



استویٰ علی العرش

قرآن کریم میں جس آیت سے اللہ تعالیٰ جلّ و علا شانہٗ کے عرش پر قرار پکڑنے کا مفہوم ملتا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا فرمایا اور پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا۔

آیت مذکورہ میں استوی علی العرش کا لفظ بطور کنایہ کے استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے زمین و آسمان پیدا کر کے اور اپنی تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر تنزیہی صفات اختیار کرنے کے لیے مقام بلند اختیار فرما لیا یعنی تنزیہی صفات بھی ثابت کر دیں۔ پس میں جو مقام وراء الورا اور مخلوق کے قرب و جوار سے دُور تر اور بلند تر ہے اسی کو عرش کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کی واضح تر تشریح یہ ہے کہ جب تمام مخلوق پردۂ عدم میں مستور تھی اور سوائے خداوندِ عالم کے کچھ نہ تھا تو خداوندِ عالم اسی مقام میں جس کا نام اصطلاحِ قرآنی میں عرش ہے اپنی تجلیات ظاہر فرما رہا تھا۔ پھر اس نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے پیدا فرمایا اور اپنے تئیں مخفی فرما لیا اور یہ چاہا کہ وہ ان مصنوعات کے ذریعے سے پہچانا جائے مختصر یہ کہ عرش کوئی مخلوق چیز نہیں صرف تجرّد کے وراء الورا مرتبہ کا نام ہے۔

اس قسم کا مضمون متشابہات میں داخل ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ عرش اعظم پر برابر قائم ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ عرش پر بیٹھا ہے۔ خداوند عالم صاحبِ تخت ضرور ہے مگر جسمانی نہیں اور نہ عرش کا محتاج ہے ہاں عرش سے مراد وہ بلند و مقدّس مقام ہے جو اس جہان سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ علامہ کمال بن ہمام نے لکھا ہے۔ کہ استوی علی العرش کی حقیقت عوام کے فہم سے بالاتر ہے پس مراد اس سے رب العزت جلّ و علا شانہٗ کا عرش پر قائم ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم کمالِ قدرت اور تدبیرِ ملک و

ملکوت ہے۔ امام فخرالدین رازی فرماتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ استوی علی العرش کو ظاہری معنوں پر محمول کیا جا سکے اور اس کے معنی عرش پر بیٹھنے اور قرار پکڑنے کے لیے جا سکیں کیونکہ اللہ تعالٰے مکان اور جہت سے پاک ہے اور ہم اس کی تاویل وتفصیل نہ کرتے ہوئے اس کے علم اور حقیقت کو اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہٗ پر ہی چھوڑتے ہیں اور قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ عرش استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد خدا کی عظمت و جبروت تنزیہ وتقدس اور بلندی وبرتری ہے۔ اس بنا پر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب خداوند عالم نے دنیا کو پیدا کر دیا اور اس کی تمام صفات ظہور میں آگئیں تو گویا رب العزت اپنے تخت ربوبیت پر اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگیا۔ یعنی کوئی صفت صفات لازمۂ الوہیت ایسی نہ رہی جس کا ظہور نہ ہو چکا ہو۔ گویا خداوند عالم کا عرش پر قرار پکڑنا صفات خالقیت، ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کو دنیا پر نافذ کرنا اور ظہور میں لانا ہے اور اسی کا نام عرش ہے۔ امام صاحب لفظ عرش کے معنوں میں ایک صورت یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کنایہ کے پیرایہ میں مقصود کی تعریف ہے۔ یعنی استوی علی العرش سے مراد نفاذ قدرت اور ارادہ کا جاری ہونا ہے۔

کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرش پر مستوی ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کی کیفیت سمجھ سے بالکل باہر ہے اور یہ استوا ایسا ہے جو اس کی شانِ پاک کے لائق ہے۔ یعنی کوئی جاہل یہ گمان نہ کرے کہ عرش پر مستوی ہونا ایسی ہی کیفیت ظاہری پر مبنی ہے۔ کیونکہ حضرت باری تعالیٰ جل شانہٗ کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں اور نہ آدمی کے قیاس و صفات کو مجال ہے۔ پس جب یہ واضح ہو گیا کہ اللہ تعالٰے کسی چیز سے مشابہ نہیں تو پھر جو کیفیت بندہ تصور کرے وہ حادث ہو گی۔ اور حادثہ سے اللہ تعالٰے پاک ہے۔ متقدمین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ایسی آیات کو جو اللہ تعالیٰ کی شان میں ہیں ان پر بلا تاویل اس طرح ایمان لاتے رہے جس طرح وہ بغیر ذکر کیفیت کے نازل ہوئیں اور یقین رکھتے تھے کہ یہاں قیاس وگمان باطل ہیں۔ ہاں متاخرین نے ان آیات میں تاویلوں سے کام لیا ہے تاکہ کچھ مفہوم سمجھ کے قابل ہو جائے لیکن وہ تاویلات ہر مقام پر صحیح نہیں بلکہ بے ضرورت سی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ بکثرت احادیث جو صفات میں وارد ہیں ان میں بعض جگہ تاویل کام دیتی ہے اور بعض جگہ نہیں دیتی۔ لہٰذا آیات و احادیث

صفات کو اپنے معنے پر یقین کرے اور اپنے قیاس کو دخل نہ دے۔ ہاں کسی مناسبت لغوی یا عرفی کی وجہ سے مجازی و کنائی معنے لیے جائیں تو ہرج نہیں۔

پھر نورِ الہیٰ کے دو بنیادی اصولوں پر یہ بحث ختم ہو جاتی ہے کہ خدائے قدوس نے عاجز انسان اور اس کی نارسا عقل کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کے لیے اپنی ذات و صفات کو قرآن کریم میں دو طرح سے بیان کیا ہے۔ اوّل اس طور پر کہ اس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات سے مشابہ معلوم ہوتی ہیں اور تجسّم پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً اس کی آنکھیں، اس کی ساقیں، اس کے کان، اس کے ہاتھ، اس کا منہ وغیرہ اس قسم کی بیسیوں تشبیہات ہیں جو قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ میں وارد ہیں اور جس میں کثرت کے ساتھ تشبیہ کے الفاظ آئے ہیں اور انسان کو اللہ تعالےٰ نے ان تشبیہی صفات کا علم بھی دیا ہے جن کے ساتھ بظاہر انسان کی شراکت نظر آتی ہے اور یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ گویا انسان ان صفات میں رب العزت جلّ شانہٗ سے مشابہ ہے۔ دوئم ان تشبیہی صفات کے مقابلہ میں تنزیہی صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ وعلا شانہٗ کو اپنی ذات و صفات میں انسان کی ذات و صفات سے کسی طرح کی بھی کوئی مشابہت اور شراکت نہیں اور خداوند عالم جلّ مجدہٗ اپنی ذات و صفات میں انسان سے بالکل علیحدہ ہے۔

حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ اس مسئلہ کو اس طرح حل فرماتے ہیں کہ بے شبہ قرآن و حدیث میں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں لیکن یکجا نہیں ہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ مقامات پر ہیں اور چونکہ تنزیہ کے مسئلہ کو شارع عہ نے نہایت کثرت سے بار بار بیان کر کے دلوں میں جاگزین کر دیا تھا اس لیے تشبیہ کے الفاظ سے حقیقی تشبیہ کا خیال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ کعبہ مکرمہ رب العزت جلّ وعلا شانہٗ کا گھر ہے۔ تو اس سے کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ خدائے قدوس حقیقتاً کعبہ مکرمہ میں سکونت پذیر ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیتوں سے بھی جن میں عرش کو خداوند عالم کا مستقر بیان ہوا ہے۔ خداوند عالم کے استقرار علی العرش کا خیال نہیں آ سکتا۔ اور کسی کو آئے بھی تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ اُس نے تنزیہ کی آیات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

خیر و شر

فلسفہ اور مذہب دونوں کے لیے یہ مسئلہ سب سے زیادہ دقیق اور سب سے زیادہ غامض ہے ۔ اور انسانی تجربہ و علم کے سارے وسیع دائرہ میں اس سے زیادہ پریشان کن اور کوئی مسئلہ نہیں ملتا۔ یہ مسئلہ نہیں بلکہ ایک اچھی خاصی پیچیدہ گتھی ہے جس کے حل سے بڑے بڑے عقلا مایوس اور بڑے بڑے فلاسفر عاجز ہیں خصوصاً وہ نظامات فکر جو دنیاوی یا غائی بنیاد پر قائم ہیں۔ اس کا حل چاہتے ہیں۔ لیکن پریشانی میں مبتلا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ ع

ایں اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من

لیکن دنیا میں خیر و شر کے وجود سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ۔ کون ہے جو درد و الم میں مبتلا نہیں اور قلب و قالب دونوں کے لحاظ سے ہدف تیر بلا نہیں۔ روئے زمین پر کسی کے لیے آسودگی اور کسی کے لیے رنج و غم مسلمہ امر ہے۔ فلسفی درد و الم ہی کو طبعی شر کہتا ہے اور آرام و راحت کو اخلاقی خیر بتاتا ہے ۔ کبھی طبعی و اخلاقی شر کے وجود سے گھبرا کر چیخ اٹھتا ہے کہ آخر دنیا میں اسقدر شر کیوں ہے ۔ اس قدر ظلم و ستم، اسقدر رنج والم، اس قدر قصور و خطا، اس قدر حسن و قبح کیا سبب رکھتے ہیں۔ اس کا جواب شاید یہ ہو کہ انسان کی تکوین میں قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نے دو متضاد امر لحاظ رکھے ہیں۔ شریعت کی زبان میں ایک کو داعی الی الخیر کہتے ہیں اور دوسرے کا نام داعی الی الشر بتایا جاتا ہے یعنی ایک انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور ایک بدی کی طرف ۔ اور یہ دو متضاد داعی انسان میں اس لئے رکھے گئے ہیں کہ ایک کی خوبی اور دوسرے کی برائی ظاہر ہو کیونکہ ہر ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔

قانون قدرت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے دن کے مقابلہ میں رات، نور کے مقابلہ میں ظلمت اور شیرینی کے مقابلہ میں کڑواہٹ کو پیدا فرمایا ہے ۔ ایسا ہی اس نے انسان کے لئے نورانی مخلوق

کے مقابلہ میں ظلماتی مخلوق بھی بنائی ہے اور دو روحانی داعی مقرر فرمائے ہیں۔ایک داعی خیر جسکا نام روح القدس اور ایک داعی شر جسکا نام ابلیس ہے یہ دو نیکی اور بدی کی دعوت دیتے ہیں۔مگر کسی بات پر جبر نہیں کرتے اور یہ دونوں داعی انسان کے لیے بطور ابتلاء وآزمائش کے مقرر کیے گئے ہیں۔چونکہ خداوند عالم علت العلل ہے اور یہ دونوں داعی اس کی تخلیق سے ہیں اس لیے اسکو خالق خیر وشر کہا جاتا ہے۔ورنہ شیطان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ کسی کے دلمیں وسوسہ ڈالے اور گمراہ کرے اور نہ روح القدس کی کیا حیثیت ہے کہ وہ کسی کو تقویٰ کی راہوں پر ہدایت کرے۔

بعض کوتاہ اندیش یہ لغو اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے خالق خیر وشر ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے دانستہ طور پر انسان کے پیچھے شیطان لگا رکھا ہے۔اور آپ ہی اپنی خلقت کو گمراہ کرتا یا کراتا ہے۔ مگر اسلام کی یہ تعلیم ہر گز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو گمراہ کرنے کیلئے پیدا فرمایا ہے اور وہ کسی کو گمراہ کرنے کیلئے مجبور کر سکتا ہے۔بلکہ یہ تعلیم ہے کہ انسان کو آزمائش اور امتحان کے طور پر دو متضاد داعی دیے گئے ہیں اور امتحان سے مراد اظہار حقائق مخفیہ ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ونصیحت ہو۔اور پھر ساتھ ہی بعض حالتوں میں شیطان کا اثر کالعدم بھی ہو جاتا ہے بلکہ عبادات وریاضات شاقہ کے ذریعے سے شیطان منقاد ومتبع ہو جاتا ہے۔رہی یہ بات کہ داعی الی الشر نہ ہونے سے جب بدی کی جڑ ملکٹ جاتی تھی تو شیطان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔نہ بدی ہوتی نہ نیکی کا مقابلہ پڑتا۔اس کی حقیقت یوں ہے کہ ترکیب انسانی مختلف اور متضاد عناصر سے اس لیے کی گئی ہے کہ اس ترکیب سے ایک عمدہ نتیجہ پیدا ہو جسکو مزاج مرکب کہتے ہیں اسی طرح ترکیب جہاں میں بھلی اور بری دونوں قسم کی چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا فرمائی ہیں تاکہ خیر وشر کے اجتماع سے نیکی کی حقیقت اور ہدایت وسعادت کے آثار عجیبہ ظاہر ہوں۔اگر خدا تعالیٰ انسان کیلئے فقط داعی الی الخیر کو ہی مقرر فرماتا تو انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح کسی فضیلت اور مرتبہ کا حقدار نہ ٹھہرتا۔یہی وہ سوال تھا جو فرشتوں نے پیدائش آدم پر ترکیب متضاد عناصر کے پیش نظر کیا تھا اور رب العزت نے جواب میں فرمایا تھا کہ آدم کی پیدائش کے راز کو جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔یعنی تم نور سے پیدا ہوئے ہو جن کے لوازمات زندگی میں نہ بھوک نہ پیاس، نہ تمنا نہ شہوت، نہ سونا نہ جاگنا، نہ کھانا نہ پینا، نہ بول نہ براز

نہ اونگھ نہ غفلت کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی۔ تم ایک ہی حالت اور کیفیت پر پیدا کئے گئے ہو جس کے مدِ مقابل ابتلائی قوت کوئی نہیں لہٰذا تمہارا بے لوث اور ٹھوس عبادت کرنا کوئی قابلِ فخر چیز نہیں۔ جس ہستی میں شر کا مادہ ہی نہ پایا جاتا ہو اس کا پاکبازی کا دعویٰ ایک بے معنی تخیل کا حامل ہو گا۔ پاک باز وہ مدعی ہو سکتا ہے جو تمام لوازمات فتنہ پروری رکھے اور پھر فتنوں کو بیدار نہ ہونے دے۔ اسی حقیقت اعلیٰ کے ماتحت انسان خلافتِ الٰہیہ کا حقدار تھا اور یہی وہ فضیلت تھی جس کے سبب سے یہ مسجودِ ملائکہ بنا۔ گویا انسان میں داعیٔ شر کا پایا جانا اور اس کا اس کے اثر کو قبول نہ کر کے داعیٔ خیر کی جانب رجوع کرنا اور امتحان میں کامیاب نکلنا وہ بلندی ہے جو کسی مخلوق کو حاصل نہیں اور اسی سے انسان نیابتِ الٰہیہ کے فرائض کو سرانجام دیکر شرافت عظمیٰ کا مستحق ہوتا ہے۔

اور اگر اللہ تعالیٰ صرف داعی الی الشر ہی مقرر فرماتا تو اس کے عدل و رحم پر دھبہ ہوتا کہ اس نے شر انگیزی اور وسوسہ اندازی کی غرض سے ضعیف و کمزور انسان کو فتنہ میں ڈال دیا اور نیکی کی جانب رہنمائی کرنیکا کوئی سامان پیدا نہیں فرمایا۔ اس لیے داعی الی الخیر کو بھی انسان کا دائمی قرین بنا دیا تاکہ میزان کے دونوں پلڑے برابر ہو جائیں اور تخلیقِ الٰہی کے دونوں پہلوؤں کا ظہور ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو صرف نیکی کا وجود ہی ہوتا بدی کا نہ ہوتا۔ جس سے انسان کو اس کشمکش میں پڑنے کی زحمت ہی نہ ہوتی۔ مگر اسلام فرماتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ایسی مخلوق بھی بنائی ہے جس میں تخلیقِ الٰہی کے اس پہلو کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً ملائکہ اور حیوانات جنگلی دنیا ایسی ہے کہ اس میں کسی نیک و بد کی تمیز ہی نہیں۔ اور نہ وہ تکلفات شرعیہ کے پابند ہیں اور نہ کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بات کے جوابدہ اور نہ کسی امر کے مکلف ہیں۔ لیکن انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی و مشیت یوں ہی تھی کہ اس کو خیر و شر کے دو داعی اور کچھ اختیارات دیکر نیک و بد کے میدان میں چھوڑ دیا جائے۔ اور اس نیک و بد کی کشمکش میں پڑنے اور ہدایت کی راہ اختیار کرنے کے صلہ میں اسکو اشرف المخلوقات ٹھیرا دیا جائے۔ اب رہا یہ امر کہ خالق الکل نے انسان کو ایسا کیوں بنایا۔ اس سوال کا انسان کو کوئی حق حاصل نہیں۔ کیونکہ خداوندِ عالم کی مشیت پر جواب طلب کرنا گمراہوں اور بیوقوفوں کا کام ہے۔ مخلوق کو خالق اور محکوم کو حاکم کے کسی حکم کی علت معلوم کرنیکا کوئی بھی استحقاق نہیں۔ اس لیے کہ خداوندِ عالم کی مشیت پر کیوں کا سوال وہ کر سکتا ہے

جو اس سے زیادہ علیم و حکیم ہو۔ پھر اس کے علاوہ اگر نظامِ عالم یا انسان کے اعمال کی کوئی اور صورت بھی ہوتی تو لاتعقل انسان وہاں بھی اپنی کیوں کو استعمال کرنے سے نہ چوکتے۔ مولانا روحی علیہ الرحمۃ لاہور میں ایک بڑے فاضل بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی خدمت میں ایک شخص آیا جس نے یہی مسئلہ پیش کر کے بار بار اپنی (کیوں) کو متحرک کیا۔ حضرت مولانا روحی صاحب نے اس کی کیوں کو ختم کرنے کے لیے جیب سے دو نوٹ پانچ پانچ روپے کے نکال کر فرش پر ڈال دیے۔ اور فرمایا ان میں سے ایک اٹھالو۔ اس نے یہ سنتے ہی عرض کیا کہ میں نے سمجھ لیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تو نے کیا سمجھا ہے؟ کہنے لگا۔ میں کوئی ایک نوٹ اٹھالوں تو آپ فرمائیں گے۔ یہ کیوں اُٹھایا دوسرا کیوں نہیں اٹھایا۔ تو یہ کیوں کا سلسلہ جاری ہی رہے گا۔ جو کہیں بھی ختم نہ ہوگا جب تک کہ میں یہ نہ کہہ دوں کہ میری مرضی۔ سو معلوم ہوتا ہے کہ مشیّتِ الٰہی پر کیوں کام نہ دے گی اور اسکی مشیت پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ کیا معترض اس بات کا جواب دے سکتا ہے کہ وہ ایک مکان بناتا ہے اور اس میں بعض اینٹیں تو دیوانخانے، عبادت خانے، مہمان خانے اور خلوت خانے میں لگاتا ہے اور بعض غسلخانے اور پاخانے میں تو کیا اس کی مشیّت و مرضی کے خلاف کسی پاخانے کی اینٹ کو حق پہنچتا ہے کہ وہ خلوت خانے یا عبادت خانے میں نصب ہونے پر اصرار کرے اور پاخانے میں نہ نصب ہو اگر ایسا کسی ایک اینٹ کا مطالبہ بھی حق بجانب مان لیا جائے تو یقیناً معترض کا مکان قیامت تک مکمل نہ ہو سکے گا۔ اور ہر اینٹ کا مطالبہ کہ مجھے یہاں کیوں لگایا جا رہا ہے کبھی ختم نہ ہوگا۔

صوفیاءِ اسلام کے نزدیک تمام مسائل کا حل علم، عالم، معلوم کے نہایت سادہ الفاظ میں مل سکتا ہے ان کے نزدیک حق تعالیٰ عالم ہیں۔ علم ان ہی کو اصالۃً اور بالذات ہے اور ذواتِ خلق سب ان ہی کے معلومات ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس عقیدہ کی تائید و توثیق فرماتا ہے۔ یوں بھی جو شخص وجودِ باری تعالیٰ کا قائل ہو وہ اپنے خدائے واحد کو کبھی جاہل نہیں قرار دیگا کیوں کہ صفتِ علم اصالۃً حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ اسکی نسبت حصراً و اختصاصاً حق تعالیٰ ہی کی طرف کی جاتی ہے اور وہی علیم و حکیم ہے۔

اب علم کے لیے معلومات کا ہونا ضروری ہے اس لیے کہ علم کسی معلوم یا معروض ہی کا تو ہوتا ہے۔ اور بغیر معلوم کے علم قطعی ناممکن چونکہ حق تعالیٰ ازل ہی سے عالم ہیں (یعنی ذاتِ حق سے صفتِ علم کا انفکاک

ناممکن ہے اس لیے ذاتِ حق ازلی ہے۔ لہٰذا اس کا علم بھی ازلی ہے۔ اگر یہ عقیدہ نہ رکھا جائے تو جہل لازم آئیگا جس سے اسکی ذات منزّہ ہے اور علم بغیر معلومات کے ناممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے معلومات بھی ازلی و ابدی ہیں اب دیکھیں کہ ہر شئے قبل تخلیق حق تعالیٰ کی معلوم ہے کیونکہ حق تعالیٰ جان کر پیدا فرماتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ہر شئے ماہیتۂ معلوم ہے اور ازل سے ہی علم الٰہی میں ثابت ہے۔ اور اشیاء مخلوقہ جو ازل سے معلوماتِ حق ہیں صوفیہ کی اصطلاح میں اعیان ثابتہ کہلاتی ہیں اور انکو صُوَرِ علمیہ حق بھی کہتے ہیں۔ یہ دراصل علمِ الٰہی کے تعینات ہیں جن کو اعدام بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ علم کی صورتیں ہیں۔ خارج میں وجود نہیں رکھتیں اور انہی کے مطابق خارج میں تخلیق ہوتی ہے۔

خیر و شر کی تمیز میں ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ جسطرح دُنیا کی دوسری چیزیں فی نفسہٖ نہ خیر ہیں نہ شر انسان ان کو خیر یا شر صرف ان کے مواقع استعمال کے لحاظ سے کہتا ہے جیسے آگ فی نفسہٖ نہ خیر ہے نہ شر۔ لیکن جب کوئی ظالم اس آگ سے کسی غریب کی جھونپڑی جلا کر خاک سیاہ کر دیتا ہے تو وہ شر ہو جاتی ہے اور جب اسی آگ سے کوئی رحم دل انسان چولھا گرم کر کے کسی بھوکے کے لیے کھانا پکاتا ہے تو وہ خیر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نیک و بد اعمال بظاہر یکساں ہیں اور ان میں نیک و بد کی تمیز نہیں کی جا سکتی۔ جب تک کہ اس غرض و غایت کا لحاظ نہ کیا جائے جس کے لیے وہ کام کیا جاتا ہے، ایک ڈاکو کا ایک مسافر کو قتل کر دینا اور حکومتِ وقت کا اس ڈاکو کو گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھا دینا اتلافِ جان کا یکساں فعل ہے اور دونوں پر موت کی کیفیت یکساں وارد ہوئی ہے مگر اہلِ جہان اگر ایک کو خیر اور ایک کو شر کہتے ہیں تو وہ اس غرض کی بنا پر کہتے ہیں جس کے لیے یہ دونوں قتل کیے گئے ہیں۔ ڈاکو جس قتل کا مرتکب ہوا ہے۔ اس سے اسکا مقصود مسافر کے مال پر ظالمانہ قبضہ تھا اور اس راہ میں اس کے مالک کے ناحق قتل کا آخری نتیجہ راستہ کی بدامنی اور ملک کی ویرانی ہے اور سزا دینے والی حکومت کی غرض لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور راستہ کا امن اور ملک کو آباد کرنا ہے اس لیے پہلا فعل شر اور دوسرا خیر کہلائے گا۔

خیر و شر کی فلسفیانہ تحقیق اور ان کی باہمی تمیز نہایت مشکل ہے۔ جس کو نہ ہر عامی و جاہل سمجھ سکتا ہے اور نہ اس سے متاثر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ خیر و شر کے اکثر امور پر تمام دنیا متفق ہے۔ اس لیے مذہب

تے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک کے لیے ایک آسان اصول یہ وضع کر دیا ہے کہ وہ تمام باتیں جن کو خداوندِ عالم پسند فرماتا ہے خیر ہے اور جن کو ناپسند فرماتا ہے شر ہے۔ اس کے اس اصول سے نہ خیر و شر کی حقیقت بدلتی ہے نہ ان کے نفع وضرر کے پہلو میں کوئی فرق آتا ہے۔ اور نہ دنیا کے فائدے اور نقصان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ اس اصول کی تاثیر دلوں میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے کہ ایک بادیہ نشین (جنگلی) سے لے کر ایک مہذب وتعلیم یافتہ شہری تک اس اصول کے ماتحت خیر پر عمل کرنے اور شر سے بچنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں جس قدر بھی خیر کا وجود ہے اور شر سے احتراز ہے۔ وہ اسی پیغمبرانہ سعی وتعلیم کا نتیجہ ہے۔ فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں کا نہیں۔ اس بحث سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ انسان اچھے اور برے افعال کا محل اور مقام ہے۔ سو بری اور ناپاک چیز کا جس جگہ وجود ہوتا ہے وہ جگہ بری اور ناپاک سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس کا بنانے والا برا اور ناپاک نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اسے منور کر دیتا ہے۔ آنکھ شیشے کو بھی دیکھتی ہے اور لوہے کے سیاہ توے کو بھی۔ مگر توے کی سیاہی سے آنکھ میں کوئی نقص نہیں آتا ہے۔ علم ہر بھلی اور بری چیز کا ہوتا ہے۔ مگر معلوم کے برے ہونے سے علم کی برائی لازم نہیں آتی۔ بلکہ بصر اور علم کا تو کمال ہی یہ ہے کہ ہر بھلی اور بری چیز کو دیکھے اور معلوم کرے علیٰ ہذا ایجاد کا کمال یہ ہے کہ اس سے اچھے اور برے دونوں قسم کے وجود ظاہر ہوں۔ جیسے امرت اور اکسیر کا ایجاد کرنا اگر موجد کا کمال ہے تو زہر کا ایجاد کرنا بھی اسی کے کمال میں داخل ہوگا۔ پس ایسے ہی اگر ذاتِ باری تعالیٰ کی ایجاد ہر خیر و شر، ایمان و کفر اور مومن و کافر سب ہی پر وارد ہو تو اس ایجاد اور موجد میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ غرض برا فقط اسی شئے کو کہا جائے گا جس کے ساتھ شر قائم ہے۔ خالق پر اعتراض نہیں آسکتا۔



جبر و قدر

جہاں عقیدۂ تقدیر کے سمجھنے میں متعدد دشواریاں اور غلط فہمیاں حائل ہیں وہاں بقول شخصے "میں نہیں سمجھا حدیث جبر و قدر" کی آواز بھی بار بار مضطربانہ انداز میں آغازِ فکر انسانی سے ہی بلند ہوتی رہی ہے لیکن انسان نے اس مسئلہ کو محض نظری کہہ کر اس پر غور و فکر کرنا کبھی ترک نہیں کیا۔ آخر اس مسئلہ میں کیا جاذبیت ہے کہ اس کے ذکر کے ساتھ ہی عامی سے عامی شخص تک کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض نظری نہیں مسلمان کا سارا نظام دینیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیمات اور تجربیات اسی مسئلہ کے فہم و افہام پر مبنی نظر آتا ہے۔ اور اس کا ماننا ہر پہلو سے ضروری اور لازمی جانا گیا ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ ایمان بالقدر کی پختگی کا ہی نتیجہ تھا۔ کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان خاک سے اٹھ کر افلاک پر پہنچے اور زندگی کے ہر شعبہ میں باکمال رہے۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مسئلہ تقدیر کو نہ ماننے اور اس کے ترک سے خدائے حکیم و علیم کے علم اور حکم کے حاوی اور محیط ہونیکا انکار لازم آتا ہے اور اسکی تخلیق و ایجاد کا کمال ظاہر نہیں ہوتا۔ نیز جب انسان کی کشتیٔ حیات مصائب و آلام کے بھنور میں محصور ہو جاتی ہے۔ اور اپنی منزل سے دوری اختیار کر لیتی ہے۔ حیرت و یاس سرمایۂ حیات کو لوٹ لیتے ہیں اور غم و الم کی ہیبت ناکیاں اس کے ولولوں کو سرد کر دیتی ہیں تو ایسی حالت میں عقیدۂ تقدیر ہی انسان کو قیام و سکوت کے تھپیڑوں سے بچا کر زندگی کے ساحلِ مراد پر پہنچا دیتا ہے۔ غرضیکہ جد و جہد کی پُر مصائب زندگی میں تقدیر ہی دنیا والوں کو ابد البقا کے بعد مسرت و کامرانی کا نغمہ سناتی ہے۔ اور انسان کہہ سکتا ہے کہ مسرت و کامرانی کی کلید اور مذہب کی جان یہی ایک مسئلۂ تقدیر ہے۔ چنانچہ حضور سرورِ کائنات مفخرِ موجودات مختارِ شش جہات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے تقدیر کے راز کو معلوم کر لیا۔ اس پر مصائب آسان ہو گئے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے

کہ حوادثات ارضی اسباب الٰہیہ کی جانب منسوب ہیں اور تقدیر سے ڈرنا ان کو ٹال نہیں سکتا۔ پس لامحالہ جب اس کا مطلوب فوت ہو جاتا ہے تو وہ منغص نہیں ہوتا اور جب مطلوب حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے مانوس نہیں ہوتا کیونکہ روحانیت کے اسرار و فوائد سے مطلع ہے اور یہ جسمانیات سے افضل ہے۔ لہٰذا وہ طلب اشیا میں کسی سے بھی جھگڑا نہیں کرتا۔ اور نہ مطالب کے فوت ہونے پر کسی سے ناراض ہوتا ہے۔ اہلِ جہان کہتے ہیں کہ انسان دکھ اور تکلیف اٹھانے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے اور مسئلہ تقدیر کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مصیبتِ عظمیٰ کے ہم معنی سمجھتے ہیں اور تمام ذلتوں اور رسوائیوں کو اسی کی جانب ہی منسوب کرتے ہیں محکوم ہیں تو تقدیر سے مفلس ہیں تو تقدیر سے، بداعمال و ذلیل ہیں تو تقدیر سے، بوسرِ پیکار ہیں تو تقدیر سے۔ حالانکہ مسئلہ تقدیر یہاں تک ہے کہ بیشک دُنیا مصیبتوں کا گھر تو ہے۔ مگر جب انسان قوانینِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کرے اور اگر وہ اس کو صحیح معنوں میں معبود مانے تو یہ دکھوں کی دنیا عیش و نشاط کی جنت بن جاتی ہے۔ اور اگر تقدیر کے یہی معنی ہوتے تو تمام نصیحت۔ ہدایت۔ تبلیغ۔ تلقین، کتاب اور رسالت ان کے حق میں کوئی مفید چیزیں نہ ہوتیں۔

اسلام کا اہلِ جہان پر کتنا بڑا احسان ہے۔ کہ اس نے کامیابی اور جدوجہد کا وہ گر سمجھا دیا ہے جو ہر درد کی دوا ہر مرض کی شفا۔ ہر مصیبت میں وجہ تسلی اور ہر تکلیف میں باعثِ تسکین ہے۔ مگر وائے بدبختی کہ اپنے اور پرائے ہمارے قومی تنزل و انحطاط کا سبب اسی عقیدۂ تقدیر کو ٹھیراتے ہیں اور مسلمان خود بھی اپنی پست ہمتی، احدی پن، آرام طلبی، سہل انگاری، کاہل تشینی اور دون طبعی کے نتیجوں کا الزام اسی کے سر تھوپتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قدیم مسئلہ کے حل میں عقلی نظر ناکامیاب رہی ہے۔ اور عقل کے اس عجز ہی کو دیکھ کر سرکارِ انبیاء (فداہ امی و ابی) صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب تقدیر کا ذکر کیا جائے۔ تو تم خاموش ہو جاؤ مگر یہ حکم عوام کے لیے ہے۔ عالم اور باخبر سے فرمایا گیا ہے کہ مسئلہ تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے راز کو افشا نہ کرو۔ اس دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں پر اس اہم مسئلہ کو فاش کر دیا ہے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے سب سے بڑے صوفی شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی بھی یہی رائے ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ رازِ قدر بزرگ ترین علوم

سے ہے اور اس سے حق تعالیٰ سوائے اس کے کسی کو آگاہ نہیں فرماتے جس کو انہوں نے معرفت تامہ کے ساتھ مختص فرما لیا ہو۔ اسی کی تائید ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے بھی یوں ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اس کو شروع کیا ہے آپ نے فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تو کیا پھر ہمیں توکل نہیں کرنا چاہیئے۔ گویا ہم ترک عمل نہ کر دیں۔ یعنی جب پہلے ہی سے ساری چیزیں معیّن اور مقدّر ہو چکی ہیں تو پھر ہماری کوشش اور عمل بفائدہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کام کئے جاؤ ہر شخص کے لیے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جواب سن کر عرض کیا۔ اَلْاٰنَ طَابَ الْعَمَلُ اور اپنے کام پر لگ گئے۔ تقدیر کے بہانہ سے عمل ترک نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ادائے فرض میں ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے اور کوشش کو تشویش وفکر سے نجات مل جاتی ہے ہم جان لیتے ہیں کہ ہر شخص کے لیے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں جب آپ سے عرض کیا گیا کہ جو افسوں ہم کرتے ہیں اور جو ادویات ہم استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں (فرمایا) کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی تقدیر ہی سے ہوتا ہے اور یہ ارشاد اور بھی وضاحت فرماتا ہے کہ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اس امر پر ایمان نہ لائے کہ خیر وشر کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔

تقدیر کا مسئلہ چونکہ عوام تو کیا اکثر خواص کی عقول سے بھی بالاتر ہے۔ اسی لیے حدیث اس میں زیادہ غور وخوض کرنے سے منع فرماتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضور علیہ السلام نے دو شخصوں کو مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرتے سنا تو حجرۂ شریف سے بحالت غضب باہر تشریف لائے اور فرمایا پہلی اُمتوں کے لوگ اسی قیل و قال سے گمراہ ہوئے تھے۔ میں تاکید سے کہتا ہوں کہ پھر اس مسئلہ میں گفتگو نہ کرنا۔ مجمل طور پر اس مسئلہ کی نسبت یہ جان لینا کافی ہے کہ چونکہ خداوند عالم جلّشانہٗ علیم الغیب ہیں اور انہوں نے پیدائش سے پہلے ہر ایک چیز کا اندازہ کر رکھا ہے اور ہر مخلوق کے جزو اور کل کے حالات سے واقف ہیں۔ اور یہ

علم کہ زید فلاں وقت فلاں جگہ فلاں نسب میں پیدا ہوگا۔ اتنی عمر پائیگا۔ یہ یہ کام کرے گا۔ اور فلاں مقام پر فلاں بیماری یا حادثہ سے وفات پائے گا۔ تقدیر کہلاتا ہے جبکہ ابھی زید کا نام ونشان نہ تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شجر و حجر کی طرح انسان بھی مجبور محض ہے۔ مگر ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا بھی خالق ہے۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تمہیں اور جو تم کرتے ہو۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حق تعالیٰ انسانی افعال کے بھی خالق ہیں۔ لیکن انسان ان کا ذمہ دار ہے کیونکہ وہ اپنے افعال کا کاسب ہے اور اسی لیے وہ جزا و سزا کا مستحق بھی ہے۔ اسی لیے اوامر و نواہی کا نزول ہوا ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ وعدے اور وعید بھی کیے ہیں۔ اسکی تصدیق قرآن کریم کے ان الفاظ سے بھی ہو جاتی ہے۔ جو سورۂ بقر میں ارشاد ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہیں تکلیف دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا معلوم ہوا کہ افعال کی ذمہ داری کا بار انسان پر رکھا گیا ہے اور وہ اپنے خیر کا کاسب ہے اور اپنے شر کو بھگتتا ہے ظاہر ہے کہ اخلاقی فعل کا صحیح معنوں میں اسوقت تک ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ فاعل اپنے فعل کا خود ذمہ دار نہ ہو۔ مثلاً اگر ایک شخص سو رہا ہے اسکو دار و ئے بیہوشی دے دی گئی ہے۔ یا پاگل یا طفل شیر خوار ہے تو وہ اخلاقیاتی معنوں کے لحاظ سے فاعل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا فعل اختیاری اور عقلی ارادہ پر مبنی نہیں۔ اور جب قرآن کریم میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لیے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے تو انسان کو اس کے ارادہ اور اختیار کی بنا پر ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ کسی صوفی کا یہ قول کیا لطیف ہے کہ جو قدر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو معاصی کو خدا کے ذمہ لگاتا ہے وہ فاجر ہے۔

عوام اس مسئلہ میں بحث کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ جب ہر چیز کا خالق خدا ہے تو بندے کے ذمے گناہ کیوں لگایا جاتا ہے اسکی بحث پیچھے گزر چکی ہے۔ لیکن عوام کا یہ اعتراض انکی نافہمی پر مبنی ہے۔ اگر ذرا بھی غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً:۔

زید کو ایک مکان میں جس کے مشرق و مغرب کے دو دروازے میں رکھ دیا گیا ہے اور اس کو وہاں سے

باہر نکلنے کے اختیارات بھی دے دیئے گئے ہیں کہ جب چاہے اور جس دروازہ سے چاہے گزرے ان اختیارات کے ساتھ اس کو یہ علم بھی دے دیا گیا ہے کہ مشرقی دروازہ سے گزرنے پر ایک پونڈ تم کو ملے گا اور مغربی دروازے سے گزروگے تو تمہاری ٹانگ ٹوٹ جائیگی اب جس سے گزروگے اس کا صلہ پاؤگے مگر یہ سب کچھ ظہور میں آنے سے قبل عالم الغیب نے اپنے علم میں یہ معلوم کر لیا ہے۔ کہ یہ اپنے معلومات و اختیارات کی بنا پر مغربی دروازے ہی سے گزرے گا اور ٹانگ توڑ لیگا۔ پھر ایسا ہی ظہور میں آیا کہ زید مغربی دروازے سے گزرا اور اسکی ٹانگ ٹوٹ گئی تو یہ فعل زید کا ہے۔ جس کے عمل نے یہ تکلیف پیدا کر دی ہے۔ عالم الغیب کے علم نے اس پر جبر نہیں کیا بلکہ زید کے عمل نے اس کے علم غیب کی تصدیق کر دی ہے کہ اس کا علم غیب بلاشبہ صحیح ہے۔ گویا بندہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو اس کام کی قدرت عطا فرما دیتا ہے اور اگر بد کام کا قصد کرتا ہے تو اسکی طاقت بھی اس کو مل جاتی ہے۔ پس جب چور نے چوری کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے حسب عادت اس کو قدرت دے دی تو گویا چور نے نیک کام کی قدرت کو زائل کر دیا۔ اگر وہ چوری کی بجائے حلال مال کا قصد کرتا تو اس کو حلال کی قدرت عطا ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان افعال بد میں مستحق عذاب اور افعال نیک میں مستحق ثواب ہوتا ہے۔



حشر و نشر

قرآنِ کریم میں مسئلۂ توحید کے بعد سب سے زیادہ زور یوم دین یا قیامت کے اعتقاد پر دیا گیا ہے اور مختلف ناموں بیانوں اور حکموں کے ساتھ اکیسو نیرال مقامات پر اس کا ذکر خیر ہے۔ کیونکہ موجودہ دنیا اور موجودہ انسانی زندگی کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آخرت کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے اور اگر خدانخواستہ عقیدہ میں یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ زیخ و بن سے نکل جائیگا۔

آخرت کی پہلی منزل احکام خداوندی میں برزخ یا قبر ہے۔ یہ لفظ برزخ ایک عربی لفظ ہے جو مرکّب ہے "زخ" اور "بر" سے جس کے معنی پردہ کے ہیں۔ یعنی حیاتِ دنیوی اور حیاتِ آخروی کے درمیان کا یہ زمانہ بطور پردہ کے حائل رہیگا۔ گویا طریق کسب اعمال ختم ہوگیا اور انسان ایک مخفی حالت میں پڑگیا۔ لغت میں برزخ اس مفہوم میں آیا ہے جو دو چیزیں کے درمیان واقع ہو چونکہ یہ زمانہ عالم بعث اور عالم نشأۂ اولیٰ کے درمیان واقع ہے اس لیے اسکو برزخ کہا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے ماتحت حضرت محی الدین ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ برزخ معلوم اور غیر معلوم، بود اور نابود، معقول اور غیر معقول کے درمیان ایک امرِ فاصل ہے۔ اس لیے برزخ کہلاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس آیت کے ماتحت وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ بالکل واضح فرمادیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مرنے والوں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ ہے جبکہ وہ قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور اسی عالم کا نام دوسری اصطلاح میں قبر ہے خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعرِ دریا میں یا کسی درندے کے پیٹ میں یا جل کر راکھ ہو جانے میں۔ اسی لیے دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کو جو قبروں میں ہیں، اٹھائیگا جس سے ثابت ہوا کہ یہ بعث صرف انہی مُردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر مرنے والے کے لیے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو۔ گویا قبر سے مراد اور مقصود ہر وہ مقام ہے

جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی ہو۔ قرآن کریم نے انسان کے لیے تین مقام بیان فرمائے ہیں۔
(۱) دنیا (۲) برزخ (۳) دار القرار۔ اور ہر مقام کے لیے علیحدہ علیحدہ کچھ احکام ٹھہرائے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں
اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی جہان کی باتوں کو سمجھنے کے لیے ایک عجیب قدرت کی چیز ہم کو عنایت کی ہے اور وہ نیند ہے۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ نمبر (۱) ادراک و احساس (۲) تدبیر و تغذیہ۔ نیند وہ عالم ہے کہ جس میں ہمارے تمام آلات ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ ہو جاتے ہیں تاہم روح کا تعلق جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی اور نشو و بقا کی تدبیروں اور اعضائے رئیسہ کی غذا رسانی اور دوران خون میں مصروف رہتی ہے اور اس روحی تعلق کا نام تدبیری تعلق ہے۔ نیند اور موت میں فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق باقی رہتا ہے۔ اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے۔ لیکن موت کی حالت میں روح کا جسم سے تدبیری تعلق بھی اُٹھ جاتا ہے۔ اس لیے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ سورہ زمر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مرتے ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم جاری کیا اس کو روک لیتا ہے۔ اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم جاری نہیں ہوا یعنی صرف نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے یعنی جب تک کہ وہ اپنی مقررہ عمر کی میعاد کو پورا کرے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے روح کی ایک گہری اور طویل نیند کے مشابہ ہے خواب میں لذت و الم کی کیفیت یوں معلوم ہوتی ہے کہ انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے ادراک کی تمثیلی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ خود اپنے جسم کو ہو بہو دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا، پھرتا دیکھتا سنتا، کھاتا پیتا ہے۔ اس کے سامنے لطف انگیزی کے سب سامان موجود ہوتے ہیں اور درد و تکلیف کی وہی صورتیں نظر آتی ہیں جو مادی دنیا میں موجود ہیں۔ اس کو خیالی عالم میں کچھ تکلیف پہنچتی ہے تو وہ روتا اور چیختا اٹھتا ہے اور اگر لذت ہے تو اسی سے لطف حاصل کرتا ہے۔ غرض عالم خواب کی

خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت عالم میں اور اس مادی دنیا کی شادی و رنج اور لذت عالم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اگر فرق ہے تو یہی کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت و تکلیف کسی قدر مدت یعنی احساس و ادراک کے موجود رہنے تک قائم رہتی ہے اور جس طرح بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح خواب والی نعمت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب کی ایک نادرہ صورت وہ ہے جسکو تمثیلی کہتے ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا جس میں درحقیقت بیٹے کو خدمت کعبہ مکرمہ کے لیے وقف کرنے کی طرف اشارہ تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو سورج اور چاند کی اور گیارہ بھائیوں کو ستاروں کی صورت میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا جس کی تعبیر یہی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوں گے۔ اور یہ سجدہ کرنے والے ان کے سامنے تعظیمی سجدہ کریں گے۔ یا جیسے شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سُولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور پرندے چونچیں مار مار کر اس میں سے کھانا لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں۔ خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی نے اپنے بھائی کا حق واجب ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے اور اگر کسی کی غیبت کی تو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا گوشت یا مردار کھا رہا ہے اور اگر وہ مالدار ہے اور بخیل ہے تو اس کا خزانہ یا مال سانپ بن کر اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر جسم انسانی میں کسی قسم کا عنصر بڑھ جائے تو خواب میں اس کے مطابق مجسم شکلیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً بلغم کی زیادتی سے دریا اور سمندر نظر آئیں گے اور سودا کی خلط بڑھ جانے سے ہاتھی اور بھینس وغیرہ کالی کالی صورتیں دکھائی دیں گی۔

چونکہ عالم برزخ کی مثال بھی خواب کی طرح ہے اور اس میں روح کو اس کے اعمال کے موافق تمثیلی سزا دی جائیگی لہٰذا اس کو سہل الفہم بنانے کے لیے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رویائے صادقہ کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ سرکارِ دو جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صبح کو فرمایا کہ

رات میں نے دیکھا ہے کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگایا اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ چنانچہ میں اُن کے ساتھ ہولیا۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر کی طرف ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے اور اس پتھر سے اس لیٹے ہوئے کے سر پر اس طرح مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چُور ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ پتھر کو اٹھا لیتا ہے اور اتنی دیر میں مجروح کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے۔ پھر ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا شخص لوہے کا آنکس لیے کھڑا ہے اور اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گردن کی گدی تک چیر ڈالتا ہے اور پھر دوسری طرف اسی طرح چیرتا ہے تب تک پہلے زخم اچھے ہو جاتے ہیں اور پھر یہی تکرار ہوتی ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھے تو دیکھا کہ تنور کی قسم کی کوئی چیز جل رہی ہے اور کچھ مرد اور عورتیں اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس تنور کے شعلے بھڑک بھڑک کر اُن لوگوں کو لپٹ جاتے ہیں اور وہ لوگ چیخنے لگ جاتے ہیں۔ اور آگے بڑھے تو ایک خون جیسی سُرخ نہر بہتی دکھائی دی اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے۔ اس نہر کے کنارے ایک اور آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں۔ تیرنے والا جب کنارے والے کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے اس کو مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منّہ سے پیٹ میں اُتر جاتا ہے اور وہ شخص پھر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد ہم اور آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا اور باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا قد آسمان میں تھا اور اُس کے چاروں طرف بہت چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا باغ ہے جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد ایک شہر نظر آیا جس کی دیواروں میں ایک ایک سونے اور ایک ایک چاندی کی اینٹ لگی تھی۔ ہم نے دروازے پر پہنچ کر دروازہ کو کھلوایا اور اندر چلے گئے تو کچھ لوگ ملے جن کا آدھا جسم نہایت ہی خوبصورت تھا اور آدھا بدصورت۔ رہبر ہمراہیوں نے ان میں سے ایک نہر کی جانب جو نہایت صاف و شفاف پانی کی بہہ رہی تھی۔ اشارہ کرکے کہا کہ اس میں غوطہ لگاؤ۔ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ خوبصورتی سے بدل گیا۔ پھر میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنتِ عدن ہے اور وہ آپ کا محل ہے۔ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک محل سفید ابر کی طرح دکھائی دیا۔ پھر میں نے ہمراہیوں سے پوچھا کہ ان عجیب وغریب چیزوں

سے جو میں نے آج دیکھی ہیں اطلاع دو۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر کچلا جا رہا تھا وہ ہے جو قرآن پڑھ کر عمل نہیں کرتا اور صبح کی نماز سے غافل سو رہتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو جھوٹ بولتا ہے۔ اور جھوٹ کو تمام دنیا میں پھیلاتا ہے۔ تیسرے وہ تمام مرد اور عورتیں ہیں جو بدکاری کرتے ہیں۔ چوتھا سود خوار آدمی ہے اور پانچواں دراز قد آدمی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ کمسن اولاد تھے جو دینِ فطرت پر فوت ہوئے۔ اثنائے بیان میں کسی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ علیک السلام کیا مشرکوں کے بچے بھی تو آپ نے فرمایا۔ ہاں۔ پھر فرمایا کہ وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کئے اور کچھ بُرے تو خدائے واحد نے ان کے گناہ دھو دئے۔ (صحیح بخاری)

قبر کے سوال و جواب کے متعلق احادیث میں تصریح اور قرآنِ پاک میں کنایہ کے طور پر ذکر ہے۔ احادیث میں جو تصریح ہے وہ یہی ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور توحید و رسالت و دین کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ اگر بندہ مومن ہو تو صحیح جواب دیتا ہے اور جو مشرک و کافر ہو تو انکار کر دیتا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں قرآنِ کریم میں حسب ذیل کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو اس دنیا میں پکی بات پر ثابت قدم رکھیگا اور آخرت میں بھی اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کر دے گا۔ تفاسیر میں قولِ ثابت سے نکیرین کے سوال و جواب کی طرف اشارہ ہونا بتلایا گیا ہے۔

حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ موت کے معنے فقط تغیّر حال ہے اور روح جسم سے مفارقت کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور اس کو یا تو عذاب دیا جاتا ہے یا ثواب اور جسم سے مفارقت کے معنے جسم سے نکل جانے کے باعث جسم سے تصرف کا منقطع ہو جانا ہے کیونکہ اعضاء روح کے لیے بمنزلہ آلات کے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ہاتھ سے گرفت کرتی ہے۔ کان سے سنتی ہے۔ آنکھ سے دیکھتی ہے اور قلب سے حقائق اشیاء کو معلوم کرتی ہے (یہاں قلب سے عبارت روح ہے) اور اشیاء کو بغیر ان آلات کے ذاتی طور پر جانتی ہے رنج و غم اور اندوہ و ملال سے رنج پاتی ہے۔ اور فرحت و سرور سے راحت پاتی ہے اور یہ تمام باتیں اعضاء سے متعلق نہیں اور وہ تمام امور جو روح کے ذاتی اوصاف ہیں۔ جسم سے مفارقت کے بعد بھی اس کے ساتھ باقی رہتے ہیں اور جو امور بواسطۂ اعضاء کے ہیں۔ وہ بدنی موت سے معطل ہو جاتے ہیں۔ جب تک کہ

روح جسم کی طرف نہ لوٹائی جائے اور یہ کوئی بعید نہیں کہ قبر میں روح لوٹا دی جائے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ یوم بعث تک مؤخر کر دی جائے اور اس بات کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس بندہ پر کیا حکم لگایا جائے۔

یہاں پر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ برزخ میں ارواح کا مسکن کہاں ہیں۔ اس پر بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اگر وہ روحِ مومن ہے اور اس نے نکیرین کے جوابات صحیح دے دیے ہیں تو اس کو حسب ذیل بشارت دی جاتی ہے۔" اے بے فکر روح اپنے پروردگار کے پاس لوٹ آ۔ تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش۔ تو میرے بندوں میں شامل ہو اور بہشت میں داخل ہو جا۔" اور اگر یہ روح (نعوذ باللہ) کفر کرنے والی ہوگی اور اس نے نکیرین کے سوالات کا جواب نہ دیا ہوگا تو اس کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی اور زمین میں اپنے مرگھٹ کی جانب لوٹا دی جائیگی۔ جہاں پر وہ مبتلائے تکالیف و آلام اور یوم بعث تک آوارہ گردرہے گی۔ چنانچہ ذیل کی آیت میں جس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ "بے شک وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے گزر جائے۔"

اس کے بعد آخرت کی دوسری منزل یہ ہے کہ یہ ساری کائنات فنا کے گھاٹ اُتر جائے گی اور جیسے افراد و اقوام اس دنیا میں باری باری پیدا ہوتی اور دوسرے کے لیے جگہ خالی کر کے واپس ہو جاتی رہیں اور یہی سلسلہ مدتِ مدید سے جاری آرہا ہے لیکن کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی اسی پر بعینہٖ قائم ہے۔ مگر ایک دن ایسا بھی آنیوالا ہے جب یہ ساری بساطِ ہستی اُلٹ جائے گی اور زمین و آسمان سب تباہ ہو جائیں گے اہلِ مذاہب تو اس مسئلہ میں اثبات پر قائم ہیں ہی لیکن محققینِ سائنس بھی اس امکان کو بہرحال محال نہیں جانتے بعض کہتے ہیں کہ اس نظامِ عالم کا انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائیگا۔ بعض نے کہا کہ یہ پورا نظام جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور فضائے عالم کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچتے اور قریب تر ہوتے جا رہے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا آجائے گا جب یہ باہمی توازن بالکل باقی نہ رہے گا۔ اور یہ گرتے باہم ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے۔ کسی کا خیال ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں۔ جن میں سے ہم کو بہت کم کا علم ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں ہماری یہ زمین کسی نامعلوم

سیارے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ سائنسدانوں کی یہ قیاس آرائیاں ثابت کرتی ہیں کہ وجہ کچھ بھی ہو اس سارے نظام کا فنا ہونا یقینی ہے اور سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ منکرین قیامت کے نظریات میں اس فنائیت کے بعد پھر بقا ہو گی یا نہیں۔ اور یہ شبہ کہ مرنے کے بعد کوئی زندہ بھی ہو سکتا ہے؟ اور اگر اب نہیں ہو سکتا تو قیامت کے دن کیونکر زندہ ہوں گے۔ جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہ تمام استبعادی شبہات نہیں کیونکہ ان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا خیال دشوار معلوم ہوتا ہے ورنہ اس زندگی پر اس کے محال ہونے کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔

قرآن کریم نے اس وہم کو دور کرنے کے لیے مندرجہ ذیل دلائل پیش کئے ہیں جن سے پوری وضاحت ہو جاتی ہے:۔

۱۔ مر کر جی اٹھنے کے بعد قرآن کریم نے بعض تاریخی مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں چار پرندوں کا ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے کے بعد ایک آواز پر زندہ ہو جانا اور دوڑتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلانے پر ان کی طرف آنا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا سو سال بعد جی اٹھنا اور پھر سو جانا۔ اصحاب کہف کا تین سو نو سال کے بعد اٹھنا اور اسکی تصدیق ہونا کہ ہم کتنا عرصہ یہاں پڑے رہے، اس سے یہ استدلال کیا گیا کہ جب چند آدمی اور پرند موت کے بعد زندہ ہو سکتے ہیں تو پوری کائنات بھی مر کر زندہ ہو سکتی ہے۔

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور مردہ ہو جاتی ہے۔ اور پھر بارش کے موسم میں اس میں نئی زندگی پیدا ہو کر اس کو با حیات بنا دیتی ہے۔ سبزے نکل آتے ہیں کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش انسانی لاشوں اور ہر اس جاندار کو بھی جو کبھی دنیا میں زندگی پا چکا ہو گا حیات یافتہ کر دے گی۔

۳۔ رب العزت جل وعلا شانہ نے آسمان بنائے۔ زمین بنائی۔ آسمان سے پانی برسایا۔ مردہ زمین سے شگوفے اور درخت اگ آئے۔ انسان کو ایک قطرۂ آب سے پیدا فرمایا تو کیا ایسا خالق الکل خدا ان کی فنا کے بعد دوبارہ ان کو پیدا کرنے پر قادر نہیں۔

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا۔ خالق بے نیاز نے اس کو ہست و موجود فرما دیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو نابود کر دے گا۔ تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانہ کو پیدا فرمایا کیا۔ وہ قادرِ مطلق دوبارہ اس کو پیدا نہیں فرما سکے گا۔ جس نے نقشِ اوّل کا ظہور فرمایا، کیا وہ نقشِ ثانی کی قدرت نہیں رکھتا۔

۵۔ دنیا میں باری باری بہت سی اقوام معرضِ وجود میں آئیں اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی قوّت و زور، مالی وسعت، اجتماعی و تمدنی عظمت اور سیاسی حکمت حاصل کی۔ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی۔ کمزور قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومتیں قائم کیں۔ مگر جب انہوں نے غرور و تکبر سے قوانینِ الٰہیہ کی مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور اس سلسلہ میں عاد و ثمود کی قومیں اور سبا و تُبّع کی حکومتیں فرعون و نمرود کی شہنشاہتیں مثالاً پیش کی گئیں تاکہ ان کا تباہ و برباد ہونا مخلوق کے لیے موجبِ عبرت ہو۔

پس ایسے خداوندِ عالم جلّ شانہٗ میں جس کی قدرتِ کاملہ کے نمونے اوپر ذکر کیے گئے ہیں اتنی بے پناہ طاقت اور وسیع قدرت موجود ہے کہ ساری کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو تباہ و نابود کر کے طرفۃ العین میں دوبارہ اس کو زندگی میں لے آئے اور یومِ قیامت پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشاء بھی یہی ہے کہ انسان اس کا یقین کرے کہ اس کے ہر عمل کا بدلہ ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر اس کی جزا و سزا کا اس کو حامل ہونا پڑے گا۔

